جلد ۹۳ مئی ۱۹۸۰ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

جو لوگ خُدا کی راہ میں مارے جائیں انھیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں۔ (القرآن)

پروفیسر عبدالحمید صدّیقی

—— اپنی تحریروں کے آئینہ میں

مُرتّبہ : محمدّ اکرام صدّیقی

یہ کتاب جناب پروفیسر عبدالحمید صدّیقی مرحوم کے سوانح اور افکار کا مجموعہ ہے۔ کتاب چار حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ مرحوم کے سوانح حیات پر مبنی ہے۔ دُوسرا حصّہ مرحُوم کے قلم سے لکھے گئے ماہنامہ ترجمان القرآن کے اداریے "اشارات" میں سے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصّے میں آپ کے مضامین کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اور آخری حصّے میں آپ کی تصانیف کا تعارف درج ہے۔ اِس لحاظ سے یہ کتاب محض ایک سوانح ہی نہیں بلکہ مرحُوم کی نگارشات کا ایک اِنتخاب بھی ہے۔

لکھنے والوں میں جناب سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی مرحُوم ، جناب مولانا نعیم صدّیقی، جناب پروفیسر اسرار احمد سہاروی ، جناب رحمان شاد ، جناب عطش دُرّانی ، جناب محمدّ اقبال صدّیقی اور دیگر حضرات شامل ہیں۔

قاضی پبلیکیشنز۔ ۱۲۱۔ ذُوالقرنین چیمبرز، گنپت روڈ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۳ | مئی ۱۹۸۰ء مطابق جمادی الاُخریٰ ۱۴۰۰ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر — ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۰۳۱۶

زر سالانہ بیس روپے۔ فی پرچہ ۲/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایس فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

پچھلی مرتبہ جو گذارشات کی تھیں، اب اس سے ذرا آگے کی باتیں ہو جائیں۔

پہلی اشد ضروری بات یہ ہے کہ آیا خادمانِ دین اور داعیانِ نظامِ حق اپنے بنیادی عقیدے، جذبے، شعور اور نصب العین کو اسی طرح تر و تازہ اور جاندار رکھنے میں کامیاب ہیں، جیسا کہ وہ ان میں کبھی پہلے تھا؟

ایمان و مقصد کی آبیاری تو مطالعہ قرآن و حدیث، اساسی عبادات کی پابندی اور ان سے صحیح ایمانی و شعوری استفادہ اور نظامِ سمع و طاعت کے احترام سے ہوتی ہے۔ دینی کردار کے لیے مزید توانائی کا حصول متعدد تدبیروں سے ممکن ہے، مثلاً مخلوقِ خدا کی مختلف امکانی طریقوں سے خدمت، خاندان، پڑوس اور اُس سے وسیع حلقے کے مستحقین کی مدد، نادار طلبہ، محنت کش غربا، محتاج بیماروں، نیز بیواؤں، یتیموں اور معذوروں کو اپنے مال اور قوتِ بازو اور اپنے وسائل سے سہارا دینے کی بے تابانہ سرگرمی، اور پھر سب سے خواص و عوام کے زیادہ سے زیادہ حلقوں کے اندر زیادہ سے زیادہ افراد تک خدا و رسول کی پکار کو پہنچانے کی مجاہدانہ تگ و دو جتنی زور دار یہ کوششیں رہی ہوں گی، اُن کی شادابی آپ کے ایمان میں، اور ویسی ہی تر و تازگی آپ کی محبتِ نصب العین میں موجود ہوگی۔ یہ اگر نہیں ہے تو بلاشبہ اس میں کچھ دوسروں کی کوتاہیوں کا حصہ بھی ہو سکتا ہے اور کچھ آپ کے ماحول اور مسائل کا اثر بھی پڑ سکتا ہے، مگر بہر صورت عنداللہ سب سے پہلی اور بڑی ذمہ داری آپ کی ہے خصوصاً جس دن سے خدا کے کسی بندے نے آپ کو تحریکِ اقامتِ دین کا شعور دلا دیا، اُس دن سے ذمہ داری کے بوجھ کا زیادہ بڑا حصہ اُس کے کندھوں پر لد گیا۔

اب جو بازپرس آپ اور مجھ سے آخرت میں ہوگی، ہو سکتا ہے کہ تھوڑی بہت رعایت ہمیں

دوسروں کی کوتاہیوں اور ماحول کی مشکلات کی وجہ سے مل جائے، مگر ہم پوری طرح یہ ثابت نہ کرسکیں گے کہ ہمارا پارٹ زیادہ تر ٹھیک رہا۔ بس غیر اختیاری وجوہ سے کہیں کوئی کسر رہ گئی۔ دوسروں کی واقعی اگر کوئی کوتاہی ثابت ہوگی تو اس کا حساب انہیں دینا ہوگا۔ لیکن اُن کو اگر بڑی سے بڑی سزا بھی مل جائے تو وہ سزا مجھے اور آپ کو بخشوا نہیں سکے گی۔

ملک کے دینی لوگ جو آپس میں مل بیٹھنے پر "کارِ دین" کی کمی کا رونا روتے ہیں، میرا مشاہدہ ہے کہ وہ سارا الزام دوسروں پہ دھرتے ہیں (چاہے وہ اُن کے اپنے ساتھی یا پیش رو ہوں، چاہے حکومت اور اُس کے کارکن ہوں، چاہے مخالفین اور معاندین) اور گفتگو جب اِس رُخ پہ چل نکلتی ہے تو اصل مبحث فراموش ہی ہو جاتا ہے۔ ہر دو دو چار چار ملنے والے بات کرتے کرتے ایک عدالت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اور کسی بھی غیر حاضر ملزم کو کٹہرے میں کھڑا کرکے اس پر فردِ جرم لگا دیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ خرابیٔ احوال اور کوتاہیٔ کار کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں۔ کم سے کم میرا تجربہ و مشاہدہ یہی ہے، کہ اس قسم کی پرائیویٹ مجالس اور گفتگوؤں میں خود شرکاء یہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کا فرض کیا ہے اور اُن کے امکان میں کیا کچھ ہے۔ اور انہیں کن کمزوریوں یا مشکلات کو دور کرکے سعی و جہد کرنی ہے، اور انہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ خود ایک کمزور پرزہ بن جانے کے بعد نیکی پھیلانے والی ساری مشینری پر کیسا بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ اور اگر ایسے ہی چند پرزے اور موجود ہوں جن میں سے کوئی ناکارہ ہو جائے، کوئی اَڑ اَڑ کر چلے، کوئی بار بار ساتھ کے پرزوں کو خراب کرے تو مجموعی نتیجے پر کیا اثر پڑے گا۔

میں ایسی گفتگوؤں کو ترس گیا کہ دینِ برحق کی دعوت پھیلانے والے دو چار دوست مل کر یہ سوال اُٹھائیں کہ آؤ بھائیو! یہ سوچیں کہ ہمارے اندر ایک عرصے سے برف کیوں گرنے لگ گئی ہے، ہمارے جذبات آئس کریم کیوں بنتے جا رہے ہیں؟ ہم ایک ٹھنڈی یخ دلدل میں آہستہ آہستہ نیچے جا رہے ہیں، آخر کیوں؟ اور پھر اس پر غور کریں کہ ہمارے اندر کس چیز کی کمی ہے؟ پہلے ہم کیا کرتے تھے جو اب نہیں کرتے، یا پہلے کیا نہیں کرتے تھے جو اب کرنے لگے ہیں؟ پھر وہ یہ مثبت قدم اُٹھائیں کہ ہم بحالاتِ موجودہ (IN SOME GIVEN CONDITIONS) اپنی قوتوں کو دین کی سربلندی کے لیے کس کس طرح استعمال کرسکتے ہیں اور جو کمی رہ گئی ہے اُس کی تلافی کیسے کرسکتے ہیں۔

میں تو کہتا ہوں کہ سچے مومن کا کام یہ ہے کہ وہ تنہائی میں خود ہی اپنے متعلق سوچے کہ وہ کہاں کہاں کوتاہی کر رہا ہے اور اُسے کس کس سرگرمی کا آغاز کر دینا چاہیے۔ نماز اسی لیے پڑھی جاتی ہے کہ قیام و قعود اور رکوع و سجود میں آدمی اپنا احتساب کرے، بستر پہ جاتے ہوئے دن بھر کا چِٹھا کھول کر نگاہوں کے سامنے رکھے، صبح جب "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ" پڑھتا ہوا اُٹھے اور دروازے سے جب بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ پکار کر قدم باہر نکالے تو نئے دن کا نیا پروگرام (ORDER OF THE DAY) اُس کے سامنے ہونا چاہیے۔

اسی تجربے کی ابتدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنی گھریلو نشستوں اور پرائیویٹ گفتگوؤں کے متعلق طے کر لیں کہ دوسروں پر الزام لگانے اور اُن کے خلاف شکایات بیان کرنے کے بجائے ہم پہلے اپنے خلاف الزام لگائیں گے۔ اور اپنے بارے میں شکایات کو زیر بحث لائیں گے۔ اور کوتاہی یا غلطی کی تلافی کریں گے۔ کسی دوسرے سے کوئی شکایت ہوگی تو پھر اس سے جا کر خلوص اور خیر خواہی اور اپنے ضمیر کی صفائی کے ساتھ بات کریں گے۔

بدقسمتی سے ہماری اکثر و بیشتر گفتگوئیں غیبت و نجویٰ کے دائرے میں چلی جاتی ہیں اور ہم اپنے گرد آلود ایمان اور جذبات پہ کئی غلاظتیں ڈال کر اُٹھتے ہیں۔

یہ دین کا کام کرنے والے حلقوں کے لیے بڑی دُور رس تباہی کے اسباب ہیں۔

دینی کام کے لیے بہت بڑا سرمایہ محبت و اخوت کا ہے۔ خدا کی راہ میں گامزن ہونے والے قلیل التعداد گروہ اس محبت و اخوت کے ذریعے "دو اور دو چار" کے بجائے "دو۲ اور دو۲ چھ۶" (یا آٹھ) ثابت ہوتے ہیں۔

محبت و اخوت کا یہ تعلق اوّلاً اس ایمان پہ قائم ہوتا ہے کہ ہم ایک خدا کے بندے ہیں، ایک رسولؐ کے مشن کے خادم ہیں۔ اور ایک ہی نصب العین کے حصول کے لیے منظم فوج بن کر کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح مشترک مخالفتوں کا احساس اتحاد و محبت کا باعث بنتا ہے اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر سیلاب کی موجوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور جس کے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں اُسے دسیوں ساتھی سہارا دینے کو موجود ہوتے ہیں

اور دیارِ محبت کے اصول اور طریقے قرآن و حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔ حسن ظن اور سلام و ہدیہ

سے لے کر ہمدردی، ایثار تک کے سارے راستے بتائے گئے ہیں۔ اور خاص طور سے ذاتی رابطوں اور ذاتی اعمال میں دلچسپی لینے کا احساس دلایا گیا ہے۔

دوسری طرف اہلِ دین کے رشتۂ محبت و اخوت کو تباہ کرنے والی چیزیں بہت سی ہیں جن کا قرآن و حدیث میں بیان ملتا ہے۔ ان میں تحقیر آمیز استہزا، بدکلامی، غیبت، بہتان اور نجویٰ جیسی باتیں اوّل درجے پر آتی ہیں۔

یہ خرابی بھی کچھ کم ضرر ناک نہیں ہے کہ کسی فرد یا کسی گروہ پر تنقید و اختلاف کو خود اس کے سامنے لانے کے بجائے ادھر ادھر پھیلایا جائے، اور مشورت کے راستے سے جہاں معاملات ہو رہے ہوں، وہاں تو رائے دہی یا اختلاف کے حق کا صحیح طریق سے استعمال نہ کیا جائے، بعد میں فیصلوں اور پالیسیوں کے خلاف رائے زنی کی جائے۔ علاوہ ازیں جب رائے دہی، اظہارِ اختلاف اور تنقید و احتساب میں حق نصح کی ادائیگی کا اہتمام نہ کیا جائے، یعنی اس میں روحِ خیر خواہی موجود نہ ہو اور ان امور کے لیے متوازن ذہن کے ساتھ مناسب الفاظ اور لہجہ اختیار نہ کیا جائے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے کسی رائے پر جمع ہو جانے کے بعد اپنی ذاتی رائے کو باقی رکھ کر اسی کے مطابق اپنی روش بنائی جائے تو اس طرح دین کا کام نہ کبھی چلا ہے، نہ آئندہ چل سکے گا۔

اقامتِ دین کی سعی بڑے اونچے حوصلے اور اولو العزمی کا کام ہے۔ اس کے لیے ذہنی توازن، دوسروں کے ساتھ جذبۂ ہم آہنگی اور ذاتی رایوں کے خلاف ہونے والے فیصلوں کی پیروی لازم ہے۔ ماسوا اس کے کہ آپ کے سر کتاب و سنّت کے نصوص کے صریحاً خلاف کوئی چیز ٹھونسی جا رہی ہو۔ روزمرّہ کام کے لیے طریقِ کار دعوت کے بنیادی اصولوں کے تحت سوچے اور اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً فرض کیجیے کہ فیصلہ یہ ہے کہ تعلیم بالغاں کے ذریعے کام کرنا ہے تو پھر ایک دیانتدار داعیِ حق کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ساری سوچ، اپنے دوستوں کے سارے مشوروں اور قابلِ عمل ساری تدبیروں کے ساتھ تعلیم بالغاں کو ذریعۂ دعوت بنائے اور کوئی اختلاف رائے اس کی سرگرمیِ عمل کو کم نہ کر سکے۔

ایسے ہوتے ہیں سچے داعیانِ اقامتِ دین!

محبت واخوت کی فضا کو تباہ کرنے کا باعث افراد کی باہمی نزاعات بھی ہوتی ہیں۔ کچھ نزاعات کا تعلق زبان کے غلط استعمال سے ہوتا ہے اور کچھ کا تعلق نامناسب رویّے سے، کبھی کسی کی معمولی سی حق ماری (جیسے اُس کی نشست پر اُس کی اجازت کے بغیر قبضہ جما لیا، یا کسی کے راز کو افشا کیا، یا کسی کی کوئی چیز ضائع کر دی) سے تعلقات میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے۔

ایسے معاملات میں نہایت ہی سہل طریقہ جذبۂ صادق کے ساتھ معافی طلب کر لینا ہے۔ طلبِ عفو رسمی اور نمائشی بن جاتی ہے اگر اس کے ساتھ قلبی ندامت شامل نہ ہو۔ بطورِ خود معافی کا حصول اور تعلقات کی بحالی کی مہم سر نہ کی جا سکتی ہو تو کسی تیسرے آدمی سے مدد لی جا سکتی ہے۔ بہرحال دو مسلمانوں کو جلد سے جلد تعلقات کو بحال کر لینا چاہیے۔ صرف ظاہری تعلقات ہی نہیں، قلبی تعلقات بھی[۱]!

محبت واخوت کی تباہی کا ایک باعث باہمی معاملات کی خرابی ہوتا ہے۔ مثلاً مل کر کاروبار کرنے والے ساتھی اگر ایک دوسرے کے حقوق کا نقصان کریں، یا اپنے حصے سے زیادہ مال اُڑا لیں۔ یا طے شدہ معاہدے کی خلاف ورزی کریں، یا واجبات کی حسبِ وعدہ واپسی نہ کریں، یا حسابات کو چھپائیں تو ایسی تمام امکانی صورتوں میں سے کوئی بھی برادرانہ تعلقات کو خراب کر سکتی ہے۔

اس کا علاج سوائے اس کے کیا ہے کہ معاملات اور تقسیمِ حقوق و فرائض کو تحریری شکل میں لایا جائے، مفاد کی دنیا میں اُمورِ معروف کی پابندی میں کوتاہی ہو جائے تو ازسرِنو پابندی اختیار کی جائے۔ پہلے جو غلطی کی جا چکی ہو اُس کی تلافی اور معافی کی کوشش کی جائے۔ کاروبار اور دولت سے زیادہ عزیز اپنے بھائی کو رکھا جائے۔

کوئی اُلجھن واقع ہو تو ٹھنڈے طریق سے تبادلۂ خیالات کیا جائے، معاملات کا تجزیہ کیا جائے، حسابات دیکھے جائیں، شہادتیں حاصل کی جائیں۔ وضاحت کی ضرورت ہو تو وضاحت کی جائے، ثالثی کی ضرورت پڑے تو کسی معتمد علیہ بزرگ یا مشترک دوست کو ذریعہ بنایا جائے۔ کسی مرحلے پر نوبت تو تکار، گالم گلوچ اور دھینگا مشتی تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ کیونکہ یہ نفاق کی ایک علامت ہے کہ جب نزاع پیدا ہو تو کوئی شخص فجور کا راستہ اختیار کرے۔

---

[۱] قلبی تعلقات کی صحت کا معیار یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کے لیے وہی پسند یا ناپسند کرے جو اُسے خود اپنے لیے پسند یا ناپسند ہو۔

لیکن جو فریق سچا خدا پرست ہے وہ مال کا نقصان گوارا کرلے، لیکن یہ گوارا نہ کرے کہ (غلطی خواہ دوسرے کی ہو) اُس کی اخلاقی ساکھ خراب ہو، یا تھوڑے سے مال کی وجہ سے ایک مسلمان بھائی سے ہمیشہ کے لیے مقاطعہ ہو جائے۔ چھوٹے موٹے مفاد اور تھوڑے بہت مال سے دست بردار ہو کر بھی حلقۂ تعارف کو یہ تاثر نہ لینے دیا جائے کہ اسلام کا کام کرنے والا فلاں شخص جھگڑالو یا مفاد پرست ہے۔

مزید یہ کہ اگر قرض دیں تو اتنا دیں کہ اگر وہ واپس نہ ہو سکے تو آپ شروع ہی سے اُسے معاف کرنے کی نیت رکھتے ہوں۔ کسی کی مالی ضمانت دینے سے بہتر یہ ہے کہ زرِ ضمانت اپنی طرف سے ہدیہ کر دیں۔ قرض لینے کے بارے میں حد سے زیادہ اجتناب کرنا چاہیے۔ جائیدادیں اور مکان بنانے یا کاروبار چلانے یا نیچے کے معاشی دائرے سے نکل کر اُوپر کے دائرے تک پہنچنے کے لیے دوسروں سے بڑی بڑی رقمیں اپنے مالی حالات کے حقیقت پسندانہ جائزے کے بغیر لینے کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ ایسی اَدائیگیاں ناممکن ہو جاتی ہیں، اور اس طرح کی بعض مثالیں میرے نوٹس میں ہیں کہ ایک پارٹی نے دوسری سے قرض لے کر اپنے آپ کو اُونچا ضرور اُٹھا لیا مگر پھر وہ قرض کبھی واپس نہ ہو سکا۔ ہوا بھی تو کوئی جزوی، اور بقیہ ملیامیٹ ہو گیا۔ جانتے بوجھتے دوسروں کے پیسے پر کسی جھونپڑے والے کا اپنی امارت کا محل کھڑا کرنا عجیب قسم کا رومانوی (ROMANTIC) معاملہ ہے جو کبھی کبھی عیاری و چالاکی کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ ایسا طرزِ عمل اسلام کے کسی سچے خادم کو کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیے اور کسی وجہ سے ایسے واقعات میں وہ پھنس جائے تو راہِ نجات یہ ہے کہ جو قصرِ دولت کھڑا کیا ہے وہ پورا یا اُس کا کوئی حصہ (حساب کے مطابق) خوش دلی سے قرض خواہ کے حوالے کر دیا جائے۔ متوسط الحال بلکہ غریب طبقوں اور اُس کی بالائی سطح سے تعلق رکھنے والوں کو چھوٹے موٹے قرض صرف اس صورت میں لینے چاہییں جب کہ کسی بیماری، مقدمے یا دیگر مصائب کی وجہ سے بُرا وقت پیش آجائے اور ایسی ہر رقم کی واپسی کی اوّل روز سے پختہ نیت ہونی چاہیے۔ اور اس کی ادائیگی کے لیے دُعائیں (بعض مسنون دُعائیں بھی ہیں) کرنی چاہییں۔ اور پھر اگر ساری کوشش کے باوجود بروقت پوری رقم یا مقررہ قسط کی ادائی نہ ہو سکے تو تہ دل سے معذرت کر کے مزید مہلت حاصل کی جا سکتی ہے، اور اگر ایک لمبے عرصے کی کوشش کے باوجود نہ تو زائد آمدنی حاصل کر کے یا بچت کر کے رقم واپس کی جا سکی ہو اور نہ اپنی کوئی چیز بیچ کر حساب چکانا ممکن ہو تو پھر لجاجت سے کوشش کرنی چاہیے کہ قرضِ خواہ

اپنی رقم معاف کر دے۔ ایسا بھی نہ ہو سکے تو پھر کسی ایک یا چند دوستوں کے سامنے صورتِ حالات رکھ کر درخواست کی جائے کہ کچھ لوگ آپ کے قرض کا بوجھ فی سبیل اللہ اتروا دیں۔

اُوپر کی ساری گذارشات میں اہم ترین باتیں تین ہیں:

ایک یہ کہ کاروباری اشتراک میں کوئی بات ایسی نہ ہونی چاہیے کہ آپ کی آمدنی میں رزقِ حرام کا کوئی جزو شامل ہو جائے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ آپ جانتے سمجھتے ہوں۔ زبردستی کی حاصل کردہ رقم ہو یا ہیرپھیر سے اخذ کردہ مال ہو، یا حسابات سے بالا بالا کوئی آمدنی ہو، یہ چیز آپ کے سارے رزق کو ناپاک کر دے گی۔ اور جہاں رزقِ حرام پہنچ جاتا ہے، وہاں پھر نہ ایمان کی خیر ہے، نہ عبادات اور اذکار و دعوات کی۔ حدیثِ نبوی سے ظاہر ہے کہ غل وغش کا معاملہ اگر سوئی دھاگے جتنا بھی ہو تو شہید کی شہادت کی جزا پہ پانی پھر جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ قرض ایسی چیز ہے جو اگر مرتے دم آدمی کے ذمہ رہ جائے اور اس کی طرف سے ورثا کو نہ تو وصیت کی گئی ہو اور نہ وہ ادا ہی کریں۔ تو خدا بچائے، ایک پیسہ بھی پہاڑ جیسی نیکیوں کے سامنے حائل ہو جائے گا۔

آخرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو چھوٹے چھوٹے مالی اور معاملاتی اُمور میں ہم جو زیادتیاں ایک دوسرے پر کرتے ہیں وہ حد درجہ تباہ کن ہوتی ہیں۔

تیسری یہ جیسے کہ ہم اُوپر بات کر چکے ہیں، کاروباری معاملات یا قرض کے بارے میں لاپروائی یا دیدہ و دانستہ غلط منفعت اندوزی تحریک اسلامی کے سپاہیوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کدورت کا زہر بھر دیتی ہے۔

کاروباری اور معاملاتی ذمہ داریوں میں جو لوگ کوتاہ ثابت ہوتے ہیں یا دانستہ گڑبڑ کرنا جن کا وتیرہ ہوتا ہے، جو ایسی کسی بدمعاملگی کی وجہ سے بدنام ہوں، میرا علم وضمیر یہ کہتا ہے کہ اگر وہ جلد سے جلد اپنی اصلاح اور خرابیوں کی تلافی نہ کر سکیں تو انھیں تحریک اسلامی کے داعیوں کی صف میں کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ میرے بس میں ہو تو میں کسی ایسے شخص کو یہ اجازت نہ دوں کہ وہ کسی اسٹیج سے دین کی سربلندی کے وعظ کہے، وہ نظامِ حیات یا اخلاق کو سنوارنے (باقی ص ۴۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تذکرۂ انبیاء

علیہم السلام

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب اوّل ــــــــــ قصہ آدم علیہ السلام

فصل ۱۰

فصل ۱۰

مسئلۂ خلافت کے متعلق ایک بحث

تمہید

خداوندِ عالم نے، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصے میں، جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا اور جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور برائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تصرف کے اختیارات بخشے اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (AUTONOMY) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔[1]

اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوندِ عالم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے

---

[1] خلیفہ وہ جو کسی کی مِلک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اُس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کی منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے۔ یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشاء کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے، تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔ (از مؤلف)

کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمھارے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرو۔ جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمھارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمھارے لیے ہر وہ رویّہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویّہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمھیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمھیں ابدی راحت و مسرّت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنّت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی رویّہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالمِ آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

یہ فہمائش کر کے مالکِ کائنات نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اوّلین افراد (آدمؑ و حوّا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انھیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اوّلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انھیں ان کا قانونِ حیات بتا دیا گیا تھا۔

خلافت کی بحث

خلافت کی بحث میں سب سے پہلے ہم کو لغتِ عرب کی طرف رجوع کر کے یہ تحقیق کرنا چاہیے کہ کیا فی الواقع عربی زبان میں اس لفظ کے معنی صرف "جانشینی" ہی کے ہیں یا اس کے معنی نیابت کے بھی آتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی اپنی مفردات میں لکھتے ہیں:۔

والخلافة نیابة عن الغیر اما لغیبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه واما لتشریف المستخلف۔	خلافت کسی دوسرے کی نیابت ہے، خواہ منوب علیہ کے غائب ہونے کی وجہ سے ہو، یا اس کی موت کے سبب سے ہو، یا اس کے عجز کے سبب سے، یا اس شخص کو بزرگی عطا کرنے کے لیے جسے خلیفہ بنایا گیا ہے۔

لین (LANE) نے اپنی مشہور لغت مدالقاموس (ARABIC ENGLISH LEXICOM) میں لفظ خلیفہ کے معنی (SUCCESSOR) کے علاوہ (VICEGERENT) کے بھی لکھے ہیں۔

خلافت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ منوب عنہ مرجائے یا موجود نہ ہو۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا قَامَ بِالْاَمْرِ عَنْہُ اِمَّا مَعَہٗ وَاِمَّا بَعْدَہٗ۔" فلاں شخص فلاں شخص کا خلیفہ ہوا یعنی اس کی طرف سے کارپرداز ہوا خواہ اس کے ساتھ یا اس کے بعد"۔

اس مادے سے جوابواب مشتق ہوئے ہیں ان کی خاصیتوں سے اس کے معنی میں بھی تغیر واقع ہوتا ہے۔

خَلَفَ خِلَافَۃً کے معنی خلیفہ ہونے یا بعد میں آنے یا پیچھے رہنے کے ہیں۔ خَلَفَہٗ خِلَافَۃً کَانَ خَلِیْفَتَہٗ وَبَقِیَ بَعْدَہٗ وَجَاءَ بَعْدَہٗ (تاج العروس) قرآن مجید میں ہے۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ (الاعراف۔ ۲۱) یعنی" ان کے بعد ایسے ناخلف آئے یا ان کے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث ہوئے"۔ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ (اعراف۔ ۱۷) "اور موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تو میری قوم کے اندر میرے بعد میرا جانشین یا نائب ہو"۔ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ (الاعراف۔ ۱۸) "موسیٰ نے کہا کہ میرے بعد تم نے میری بہت بری نیابت کی"۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ (الزخرف۔ ۶) "اگر ہم چاہیں تو زمین میں تم میں سے ملائکہ پیدا کریں جو تمھاری جگہ آباد ہوں"۔

تَخَلَّفَ کے معنی پیچھے رہ جانے کے ہیں۔ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ (التوبۃ۔ ۱۵)

اَخْلَفَ کے معنی کھوئی ہوئی چیز واپس دینے یا دلانے یا اس کا بدل عطا کرنے کے ہیں۔ اَخْلَفَ اللّٰہُ لَکَ وَعَلَیْکَ خَیْرًا ای ابدل لک بما ذہب عنک وعوضک عنہ (نہایہ ابن اثیر) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (سبا۔ ۵) "جو تم خرچ کرو اللہ اس کا نعم البدل تم کو دے گا اور وہ بہترین رازق ہے"۔ حدیث میں ہے تَکَفَّلَ اللّٰہُ لِلْغَازِیْ اَنْ یُّخْلِفَ نَفَقَتَہٗ۔ "اللہ نے غازی کے لیے ذمہ لیا ہے کہ جو کچھ وہ خرچ کرے گا اللہ اس کا بدل عطا کرے گا"۔

خَلَّفَ اور اِسْتَخْلَفَ کے معنی اپنا خلیفہ بنانے کے ہیں، یُقَالُ خَلَّفَ فُلَانًا اِذَا جَعَلَہٗ خَلِیْفَتَہٗ کاستخلفہ (تاج العروس)

اِسْتَخْلَفَ کہہ کر اگر منوب عنہ کی تصریح نہ کی گئی ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ اپنا خلیفہ بنایا، استخلف فلانا ای جعلہ خلیفۃ لہٗ۔ اور اگر منوب عنہ کی تصریح ہو تو پھر معنی یہ ہوں گے کہ اس شخص کا جانشین بنایا

جس کا ذکر کیا گیا ہے استخلف فلانا من فلان ای جعلہ مکانہ (اقرب الموارد) پس جہاں قرآن مجید نے محض استخلاف کا ذکر کیا ہے اور مستخلف لہٗ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا مثلاً لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ (النور - ۷) ایسے مقامات پر استخلاف کے معنی یہی ہوں گے کہ اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا اور جہاں مستخلف لہٗ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں معنی یہ ہوں گے کہ دوسرے کی جگہ یا دوسرے کے بعد خلیفہ بنایا۔ لیکن واضح رہے کہ جب کبھی پچھلے نائب کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نائب مقرر کرنے کا ذکر کیا جائے گا تو اس میں دونوں مفہوم شامل ہوں گے، یعنی اس کا مفہوم یہ بھی ہوگا کہ حاکم اعلیٰ نے فلاں شخص کو فلاں شخص کی جگہ مقرر کیا اور یہ بھی کہ اس نے فلاں شخص کے بعد فلاں شخص کو اپنا نائب مقرر کیا۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ استخلف الملک اللورد ادون بعد اللورد ریدنگ فی ولایۃ الھند تو اس کے یہ معنی بھی ہوں گے کہ بادشاہ نے لارڈ اردن کو لارڈ ریڈنگ کے بعد ہندوستان کی ولایت میں اپنا وائسرائے مقرر کیا۔ ان دونوں مفہوموں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے کہ بیک وقت صادق نہ آسکیں پس اِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ کا یہ مفہوم بھی ہے کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو دے دے گا اور یہ بھی کہ خدا تمہاری جگہ دوسروں کو اپنا خلیفہ بنالے گا۔ جہاں تک لغت کا تعلق ہے کوئی امر ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں مفہوم لینے میں مانع نہیں ہے۔

جَعَلَهُ خَلِيفَةً کے معنی صرف خلیفہ بنانے کے ہیں۔ خلیفہ کے معنی خواہ نائب کے ہوں یا جانشین کے، دونوں صورتوں میں اس کا مفہوم ایک اضافی مفہوم ہے اور اس کا اتمام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ کوئی مستخلف لہٗ اور منوب عنہ بھی ہو، عام اس سے مقدر ہو یا مذکور۔ پس جس جگہ جعل خلیفہ کے ساتھ قرآن مجید نے مستخلف لہٗ کی تصریح کردی ہے وہاں تو مفہوم واضح ہے، مثلاً وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (الاعراف - ۹) اور وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ عَادٍ (اعراف - ۱۰) اور ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (یونس - ۲) لیکن جہاں مستخلف لہٗ کی طرف قطعاً کوئی اشارہ نہیں ہے وہاں ایک مستخلف لہٗ مقدر ماننا پڑے گا، مثلاً يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (ص - ۲) اور وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ (النمل - ۵) اور وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ (انعام - ۲۰) اور إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ - ۴) اس طرح کی تمام آیات کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں انسان یا انسانوں کو کس کا خلیفہ بنانے کا ذکر ہے؟ اگر آپ کہتے

ہیں کہ پچھلی مخلوقات یا گزشتہ اقوام یا شاہاں پیشین کا خلیفہ، تو قطع نظر اس سے کہ یہ ایک تکلف ہے، بعض آیتوں میں یہ معنی کھینچے ہی نہیں۔ مثال کے طور پر دیجَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ میں خلفاء کو زمین کی طرف مضاف کیا گیا ہے جس کا لفظی ترجمہ زمین کے خلفاء ہے۔ اس سے یہ معنی نکالنے کی کہاں گنجائش ہے کہ زمین پر پہلے جو لوگ متمکن تھے ان کے خلفاء؛ پھر اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ "میں پچھلے ساکنینِ ارض کا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہیں اُن ساکنینِ ارض کا ذکر کیا ہے جن کی خلافت انسان کے سپرد کی گئی ہے؟ اگر کیا ہے تو حوالہ پیش کیجیے۔ اگر نہیں کیا تو فرمائیے کہ ایسی صورت میں محض زبان اور ادب کے نقطۂ نظر سے اس فقرے کا یہ مفہوم زیادہ اقرب الی الفہم ہے کہ "میں پچھلے مجہول الحال ساکنینِ ارض کا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ یا یہ کہ "میں زمین میں اپنا ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں"؟ اگر سامع صرف عربی جانتا ہو اور ان عقلی مقدمات سے نا آشنائے محض ہو جنھیں ترتیب دے کر ایک نتیجہ اخذ کیا گیا ہے، تو اس فقرے کو سن کر وہ ان دونوں معنوں میں سے کون سے معنی مراد لے گا؟

خلافت میں فرمانروائی کا مفہوم

اس لغوی تحقیق کے بعد غور فرمائیے کہ خلافت کے معنی تو محض جانشینی یا قائم مقامی یا بعد میں آنے کے ہیں، پھر اس میں بادشاہی اور فرمانروائی کا مفہوم کہاں سے آگیا؟ اگر نفسِ خلافت اس مفہوم سے خالی ہے، اور یقیناً خالی ہے تو اس میں یہ مفہوم اس اعتبار سے آسکتا ہے کہ خلیفہ کو خلافت کسی فرمانروا اور کسی سلطان سے ملی ہو۔ پھر جب انسان کو وہ خلافت ملی جس میں خود آپ کے اعتراف کے مطابق سلطنت و فرمانروائی کی جھلک ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ انسان جس کا خلیفہ ہوا وہ کوئی فرمانروا تھا۔ اب فرمائیے کہ کیا قرآن سے علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر کوئی ایسی مخلوق تھی جس میں فرمانروائی کی شان تھی؟ فرمانروائی کے لیے علم، حکمت، اختیار، ارادہ، قدرت وغیرہ صفات کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ ان کے بغیر زمین اور اس کی موجودات پر فرمانروائی نہیں ہو سکتی۔ علمی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کرۂ خاکی پر انسان سے پہلے کوئی مخلوق ایسی موجود نہ تھی جو ان صفات سے متصف ہوتی۔ اسی کی تصدیق قرآن بھی کرتا ہے۔ وہ ہم کو بتاتا ہے کہ انسان سے پہلے خدا کی جو مخلوق سب سے افضل تھی یعنی ملائکہ جن کو (عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ) کہا گیا ہے اس کا بھی یہ حال تھا کہ علم اشیاء سے بے خبر تھی (ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ

فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ . قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (البقرہ ـ ۴) اور ارادہ و اختیار کی آزادی سے بالکل محروم تھی۔ وَلَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (التحریم ـ ۱) دوسری مخلوق جن تھے، سو ان کے متعلق کوئی بات قرآن مجید نے ایسی بیان نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ ان کو زمین کی فرمانروائی حاصل تھی۔ رہے حیوانات و نباتات و جمادات، تو ان کا حال آپ جانتے ہیں۔ پھر آخر وہ کون سی مخلوق تھی جس کی خلافت، زمین کی فرمانروائی کے اعزاز کے ساتھ انسان کو حاصل ہوئی۔

تاہم اگر مان لیا جائے کہ یہ پرانے ساکنینِ ارض ہی کی خلافت ہے، اور وہ ساکنینِ ارض انسان سے پہلے زمین کے فرمانروا تھے، تو کیا وہ بالاصالت فرمانروا تھے، یا ان کی فرمانروائی بھی نائبانہ تھی؟ پہلی شق تو آپ اختیار نہیں کر سکتے، کیونکہ اسلامی عقیدہ کی رُو سے بالاصل اور بالذات فرمانروا صرف حق تعالیٰ ہے، اور اس کے سوا سب کی فرمانروائی محض عطائی ہے۔ اب رہی دوسری شق تو اس کو اختیار کرنے کی صورت میں یا تو آپ کو خلافت در خلافت کا ایک لاانتہاہی سلسلہ ماننا پڑے گا۔ یا پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ فرمانروائی کی شان خواہ یکے بعد دیگرے کتنے ہی خلفاء کو ملی ہو، بہرحال اس کا سرچشمہ وہی ذاتِ حق تعالیٰ ہے، اور خلافت میں بادشاہی کی جھلک اسی وقت آسکتی ہے جب کہ وہ خلافت الٰہی ہو۔

قرآنی اشارات

اب میں آپ کو اُن قرآنی اشارات کی طرف توجہ دلاؤں گا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جس خلافت سے سرفراز کیا گیا ہے وہ دراصل خلافتِ الٰہی ہے۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ خدا نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ (ص ـ ۵) اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی، ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ مِنْ رُّوْحِهٖ (السجدہ ـ ۱) اس کو علم کی نعمت سے سرفراز کیا، وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ ـ ۴) زمین و آسمان کی ساری چیزوں کو اس کے حق میں مسخر کر دیا، وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ ـ ۲) ان صفات کے ساتھ جب انسان کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کریں۔ یہ حکم سورۂ ص کے آخر میں جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ
اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ
فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ
مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ
فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ
اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ اِسْتَكْبَرَ
وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ قَالَ
یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ
لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ اَسْتَكْبَرْتَ
اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ۝ قَالَ
اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ
مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ
طِیْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا
فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ۝ (ص آیات ۷۱ تا ۷۷)

جب کہ تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی سے
ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پس جب میں اس کو
پورا بنا لوں اور اس کے اندر اپنی رُوح سے کچھ
پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ چنانچہ
تمام ملائکہ نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا۔ وہ گھمنڈ
میں پڑ گیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے
فرمایا کہ اے ابلیس کس چیز نے تجھے اس ہستی کو
سجدہ کرنے سے منع کیا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں
سے بنایا ہے۔ تو نے اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیا ہے
یا واقعی تو کچھ بڑے لوگوں میں سے ہے؟ اس نے
کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے
پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے بنایا ہے۔ اس پر
اللہ نے فرمایا اچھا تو یہاں سے نکل جا کیونکہ تو
مردود ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو سجدہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا۔ یعنی وہ قدرت اور صنعتِ الٰہی کا مظہرِ اَتم تھا۔ اور اس کے اندر خود اپنی طرف سے ایک خاص روح پھونکی تھی اور ایک محدود پیمانے پر اس میں وہ صفات پیدا کر دی تھیں جو بدرجۂ فوق التمام خود باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اس شان اور ان صفات پر انسان کو پیدا کرنے کے بعد اعلان کیا گیا کہ ہم اس کو زمین میں خلیفہ بنانے والے ہیں، جیسا کہ سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔ فرشتوں نے اس معاملہ میں کچھ اپنے شکوک پیش کیے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے انسان کی سب سے افضل صفت یعنی علم کا مظاہرہ کرایا۔ اس طرح جب خلافت کے لیے انسان کی اہلیت ثابت کر دی گئی تو فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اس کی خلافت تسلیم کرو اور علامتِ تسلیم کے طور پر اسے سجدہ کرو۔ تمام فرشتوں نے اسے تسلیم کیا اور سربسجود ہو گئے، مگر شیطان نے اس کی خلافت ماننے سے انکار کیا، اس لیے اس کو راندۂ درگاہ

کر دیا گیا۔

یہ تمام اشارات کیا ظاہر کر رہے ہیں؟ تمام مخلوقات پر انسان کی فضیلت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تمام مقابلہ میں اس کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ ہماری صفات کا مظہر اَتَم ہے اور ہم نے اس میں اپنی طرف سے ایک خاص روح پھونکی ہے۔ حکم ہوتا ہے اور وہ بھی کس کو؟ فرشتوں کو کہ اس کو سجدہ کرو۔ ان سب باتوں کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم اس کو خلیفہ بنانے والے ہیں۔ ان تیاریوں کے ساتھ جس خلیفہ کی خلافت کا اعلان کیا گیا، کیا وہ محض پرانے ساکنینِ ارض ہی کا خلیفہ تھا؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی کہ پرانے بسنے والوں کی جگہ کسی دوسرے کو لیا یا جا رہا تھا تو اس کے لیے فرشتوں کے سامنے اس کی خلافت کا اعلان کرنے اور یوں اس کی فضیلت کا مظاہرہ کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ملائکہ کو یہ حکم کیوں دیا گیا کہ اس کُرۂ خاکی کے نو آباد کار کو، جو فقط دوسرے لوگوں کی جگہ لینے کے لیے جا رہا تھا، سجدہ کریں؟

خلافتِ الٰہی سے مراد کیا ہے؟

دوسری بات جو قرآن مجید میں ایک اور موقع پر ارشاد ہوئی ہے، خلافتِ الٰہی کے مفہوم پر صاف روشنی ڈالتی ہے۔ فرمایا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى	”ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	پر پیش کیا تھا مگر انھوں نے اس کا بار اٹھانے
فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ	سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور انسان
مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ	نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور انجام
كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب - ۷۲)	سے بے خبر تھا۔“

اس آیت میں بارِ امانت سے مراد اختیار (FREEDOM OF CHOICE) اور ذمہ داری و جوابدہی (RESPONSIBILITY) ہے اور ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں میں اس بار کو اٹھانے کی تاب نہ تھی۔ انسان سے پہلے کی کوئی مخلوق ایسی نہ تھی جو یہ پوزیشن قبول کر سکتی۔ آخر کار انسان آیا اور اس نے یہ بار اٹھایا۔ اس بیان سے متعدد نکات نکلتے ہیں۔

۱۔ انسان سے پہلے زمین و آسمان میں کوئی مخلوق بارِ امانت کی حامل نہیں تھی۔ انسان پہلی مخلوق ہے جس نے یہ بار اٹھایا ہے۔ لہٰذا منصبِ امانت میں وہ کسی مخلوق کا جانشین (SUCCESSOR) نہیں ہے۔

۱۔ جس چیز کو سورۂ بقرہ میں خلافت کہا گیا ہے وہی چیز یہاں امانت کے لفظ سے تعبیر کی گئی ہے۔ کیونکہ وہاں فرشتوں پر ثابت کیا گیا تھا کہ تم خلافت کے اہل نہیں ہو۔ اس کا اہل انسان ہے۔ اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی مخلوق بھاری امانت کا بار اٹھانے کی اہل نہیں تھی، صرف انسان اس کا متحمل ہوا۔

۲۔ خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے۔ اور یہ دونوں لفظ نظامِ عالم میں انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین کا فرمانروا ہے مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں ہے بلکہ تفویض کردہ (DELEGATED) ہے لہٰذا اللہ نے اس کے اختیاراتِ مفوضہ (DELEGATED POWERS) کو امانت سے تعبیر کیا ہے، اور اس حیثیت سے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیاراتِ مفوضہ کو استعمال کرتا ہے اسے خلیفہ (VICEGERENT) کہا ہے۔ اس تشریح کے مطابق خلیفہ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔ (PERSON EXCERCIS-ING DELEGATED POWERS)

(باقی)

محدّثِ قرطبہ بقیّ بن مخلد رحمۃ اللہ علیہ

جناب طیب شاہین صاحب

(۴)

مسند بقی بن مخلدؒ فنِ حدیث کی اصطلاح میں حدیثِ مسند اس حدیث کو کہا جاتا ہے، جو متصل اسناد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو۔ نیز احادیث کے اس مجموعے کو بھی کہا جاتا ہے جس میں ہر صحابی کی مرویات کو علیحدہ علیحدہ جمع کیا گیا۔ متقدمین میں سے بہت سے ائمہ حدیث نے اپنی عادت کے مطابق اپنے مجموعوں میں ہر صحابی کی مرویات کو علیحدہ جمع کیا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف۔

مثلاً :-

مسند ابوداؤد طیالسیؒ	المتوفی ۲۰۴ھ
مسند اسحاق بن راہویہؒ	المتوفی ۲۳۸ھ
مسند عبد بن حُمیدؒ	المتوفی ۲۴۹ھ
مسند دارمیؒ	المتوفی ۲۵۵ھ
مسند امام احمد بن حنبلؒ	المتوفی ۲۴۱ھ
مسند بقی بن مخلد	المتوفی ۲۷۶ھ

بعض اہلِ علم کے مطابق مسند تصنیف کرنے والوں میں امام ابوداؤد طیالسیؒ کو اوّلیت حاصل

ہے۔ لیکن امام عراقیؒ رقمطراز ہیں:۔

"کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی مسند امام ابوداؤد طیالسی نے تصنیف کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ مسانید کی تصنیف میں اہل خراسان سب کے پیشرو ہیں، اس دعوے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ ابوداؤد طیالسی کا زمانہ اصحاب مسانید میں متقدم ہے"[1]

امام ابوداؤد طیالسی امام احمد بن حنبلؒ کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ امام بقی بن مخلد جب اندلس سے واپس لوٹے تو اُن کے ساتھ امام ابوبکر ابن شیبہؒ کی مصنف تھی۔ ابتداء میں انہوں نے مصنف ابن ابی شیبہؒ کا درس دیا۔ اس کے بعد امام بقیؒ نے دیگر اصحاب مسانید کی طرز پر اپنی مسند مرتب کی جس میں انہوں نے تیرہ سو سے زائد صحابہ کرامؓ کی مرویات کو جمع کیا۔ علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: "مسند بقی میں سو تیرہ سو صحابہؓ کی مرویات تھیں۔ ابن حزم مسند بقیؒ کو مسند امام احمدؒ پر فضیلت دیتے تھے۔ لیکن میں ان کے دعوے کو محل نظر سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ مسند امام احمدؒ مسند بقیؒ سے بہتر اور زیادہ جامع ہے۔"[2]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسند امام احمد بن حنبلؒ مسانید میں سب سے زیادہ جامع اور قابل اعتماد دیوانِ حدیث ہے۔ لیکن مسند بقی بن مخلد میں ایک منفرد خصوصیت ہے۔ غالباً اسی بناء پر علامہ ابن حزمؒ مسند بقی بن مخلد کو مسند امام احمد پر فوقیت دیتے ہیں۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ امام بقی بن مخلد نے اپنی مسند میں ہر صحابی کی مرویات کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کیا تھا۔ لہٰذا اُن کا مجموعہ حدیث بیک وقت مسند بھی ہے اور مصنف بھی۔ ہمارے خیال میں امام بقی بن مخلد نے اپنے دو جلیل القدر اساتذہ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابوبکر ابن ابی شیبہؒ کے مجموعوں کے فوائد کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ ان اساتذہ سے استفادہ کے دوران ان پر یہ حقیقت عیاں ہوئی ہو گی کہ مسند امام احمد کی جامعیت کے باوجود تبویب کے بغیر اس سے استفادہ کس قدر مشکل ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مجموعہ حدیث کو مسند امام احمدؒ کی طرز پر رکھا اور امام ابوبکر ابن ابی شیبہؒ کی پیروی کرتے ہوئے ہر

[1] تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی علامہ جلال الدین السیوطی طبع مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ ۱۹۵۹ء ص ۱۰۲

[2] البدایۃ والنہایۃ۔ علامہ ابن کثیر۔ مطبعۃ السعادۃ مصر جلد ۱۱ ص ۵۶

صحابی کی مرویات کو فقہی ابواب میں تقسیم کر دیا۔ جس کی بنا پر اس سے استفادہ بہت آسان ہو گیا[1]۔

طاہر بن عبدالعزیز بن عبداللہ القرطبی (المتوفی ۳۰۵ھ) کہتے ہیں:

"میں مسند بقی بن مخلد کا ایک حصہ بلادِ مشرق کے سفر میں اپنے ساتھ لے گیا اور محمد

---

[1] علمائے متاخرین میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے براہ راست اور بالاستیعاب مسند امام کا مطالعہ کیا ہو۔ یہ حضرات بقول علامہ احمد محمد شاکر متقدمین کے توسط سے مسند امام احمد کا ذکر کرتے ہیں۔ صرف چند کا نام ملتا ہے جنہوں نے مسند امام احمد کو حفظ کیا ہوا تھا۔ ان میں صرف علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے دو مشہور شاگرد علامہ ابن قیمؒ اور علامہ ابن کثیرؒ کا نام معروف ہے۔ آپ ابن تیمیہ اور ابن قیمؒ کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں بزرگ بہت ہی کثرت سے مسند امام احمد کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسندِ امام احمد تبویب سے محروم رہی اور شاید اسی لیے بہت کم علماء مسند سے استفادہ کر سکے ہیں۔ سلف میں بعض علماء افادہ عام کی خاطر مسند کی تبویب و تخریج کی تمنا کرتے رہے ہیں۔

مسند امام احمد کی تبویب و تخریج پر مصرِ جدید کے محدث و فقیہ علامہ احمد محمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت قابلِ قدر کام کیا انہوں نے ہر حدیث کی تخریج کے ساتھ ساتھ صحت و ضعف کے لحاظ سے

اس کی حیثیت اور قدر و قیمت متعین کی ہے اور حسب ضرورت بعض مقامات پر حدیث کے غریب الفاظ کی تشریح کی ہے نیز مکرر احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے پہلے امام حسن البناؒ شہید کے والد احمد بن عبدالرحمٰن بن محمد بن البناؒ نے مسند امام احمد اور مسند طیالسیؒ کی تبویب کی ہے۔ احمد البنا کی تبویب کے ساتھ مسند احمد کی کئی جلدیں اور مسند طیالسی مکمل طور پر چھپ چکی ہیں۔ (دائرہ معارف اسلامی اردو جامعہ پنجاب جلد ۴ ص ۹۸۱

مسند امام احمد کی پندرہ جلدیں جو صرف آٹھ ہزار نناوے احادیث پر مشتمل ہیں۔ علامہ احمد محمد شاکر کی تبویب و تحقیق کے ساتھ "دار المعارف مصر" سے شائع ہو چکی ہیں۔ معلوم نہیں یہ سلسلۂ اشاعت کیوں منقطع ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے اس بارے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے بذریعہ خط استفسار کیا تو مولاناؒ کی طرف سے ملک غلام علی صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ شاید علامہ احمد محمد شاکر نے اپنی زندگی میں مسند کی تبویب کا کام مکمل کر لیا تھا۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس کی طباعت منقطع ہو گئی۔

بن اسمٰعیل الصائغ (المتوفی ۲۷۶ھ) کو دکھایا وہ امام بقی بن مخلد کے کثرت علم سے بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے اس شخص نے اسے علم کے سمندر سے حاصل کیا ہے[1]

مسند بقی بن مخلد رح ایک اہم ترین مجموعہ حدیث تھا۔ علامہ ابن الجوزی رح کے مطابق تمام مسانید و جوامع میں سے مسند بقی میں سب سے زیادہ احادیث تھیں[2]۔ اس میں بعض صحابہ رض سے دو ہزار سے زیادہ احادیث مروی تھیں۔ بعض صحابہ ایسے بھی ہیں جن سے ایک ہزار سے زیادہ احادیث روایت کی گئی تھیں۔ اور اس طرح بعض ایسے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں جن کی صرف ایک ایک حدیث اس عظیم دیوانِ حدیث میں شامل تھی[3]۔ ان صحابہ کرام کے اسماء کو امام بقی بن مخلد کے ایک شاگرد (ابو محمد عبد اللہ بن یونس قبری (المتوفی ۳۳۰ھ) نے ایک مستقل تصنیف "الاعداد" میں جمع کیا ہے۔ یہ کتاب "آیا صوفیا" میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک تصنیف جس میں صحابہ کی مرویات کی تعداد کا ذکر ہے، برلن میں موجود ہے[3]۔ علامہ احمد محمد شاکر رح "تلقیح فہوم اہل الاثر" مصنفہ ابن الجوزی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ علامہ ابن الجوزی رح نے کثیر الروایت صحابہ کی مرویات کو شمار میں مسند بقی بن مخلد پر اعتماد کیا ہے۔ کیونکہ یہ سب سے جامع دیوانِ حدیث ہے۔ علامہ ابن الجوزی مسند بقی بن مخلد میں کثیر الروایت صحابہ کی مرویات کی تعداد حسب ذیل ہے[5]۔

۱۔ حضرت ابوہریرۃ رض	۵۳۷۴	۶۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رض	۱۵۴۰
۲۔ حضرت عائشہ رض	۲۲۱۰	۷۔ حضرت ابو سعید خدری رض	۱۱۷۰
۳۔ حضرت انس بن مالک رض	۲۲۸۶	۸۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رض	۸۴۸
حضرت عبد اللہ بن عباس رض	۱۶۶۰	۹۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رض	۷۰۰
۵۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رض	۲۶۳۰		

لہ حاشیہ نفح الطیب۔ جلد ۹ ص ۲۸۹

ٹہ الباعث الحثیث شرح مختصر علوم الحدیث علامہ احمد محمد شاکر مطبعۃ محمد علی صبیح مصر ص ۱۸۵

سہ تاریخ الادب العربی کارل بروکلمان تعریب ڈاکٹر عبد الحلیم نجار۔ طبع دار المعارف مصر، طبع ثالث جلد ۳ ص ۲۰۲

سہ الباعث الحثیث ص ۱۸۶ ہ ایضاً ص ۱۸۷

علامہ احمد محمد شاکرؒ علامہ ابن الجوزیؒ کی ذکر کردہ مرویات کی اس تعداد پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"آج کل جتنی کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں، ان میں سے مسند امام احمد میں سب سے زیادہ احادیث ہیں لیکن علامہ ابن الجوزی نے امام احمدؒ اور امام بقیؒ کی مسانید کی مرویات کی تعداد میں بہت زیادہ فرق بتایا ہے - یہ فرق جو ابن الجوزیؒ نے بتایا ہے ممکن نہیں کہ اتنی کثیر تعداد میں احادیث امام احمدؒ سے رہ گئی ہوں - میرا اعتقاد ہے کہ ابن الجوزی کا یہ خیال اس بات کی پیداوار ہے کہ انہوں نے ایک حدیث کے مختلف طرق کو متعدد احادیث شمار کیا ہے - حالانکہ جناب امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند کے متعلق تو یہاں تک فرمایا ہے -

"یہ ایسا مجموعہ حدیث ہے جسے میں نے ساڑھے سات لاکھ احادیث میں سے منتخب کیا ہے - اس لیے جب مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کے متعلق اختلاف کریں تو اس مسند کی طرف رجوع کرو اگر وہ حدیث اس مسند میں موجود ہے تو واقعی حدیثِ رسول ہے ورنہ نہیں"۔

اس میں کوئی شک نہیں بہت سی احادیث مسند امام احمد میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں، مگر اس کثرت سے نہیں جو مسند امام احمد اور مسند بقی بن مخلد کی احادیث کے فرق سے ظاہر ہوتی ہے - کتبِ سنت کا تتبع کرنے والے اہل علم اس حقیقت کو واضح طور پر جانتے ہیں -

مکرر احادیث کو حذف کرکے اور اس تعددِ طرق کا عدم اعتبار کرتے ہوئے مسند امام احمدؒ کی احادیث کو شمار کرنا بہت اہم اور مشکل کام ہے - میں صرف مسند ابی ہریرہؓ کی احادیث کو شمار کر سکا ہوں - جن کی تعداد مکررات کو حذف کرنے کے بعد ایک ہزار پانچ سو اناسی (۱۵۷۹) بنتی ہے - علامہ ابن الجوزیؒ نے مسند بقی بن مخلد میں پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) احادیث شمار کی ہیں - اس لحاظ سے ابن الجوزی نے جو عدد ذکر کیا ہے وہ بہت زیادہ ہے - کیا باقی (۳۷۹۵) احادیث امام احمدؒ سے رہ گئی ہیں؟ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہوا ہوگا۔

جس بات کو میں ترجیح دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ ابن الجوزیؒ نے مسند ابی ہریرہؓ میں امام بقی

بن مخلد کی روایت کردہ تمام مرویات کو شمار کیا ہے جن میں مکررات بھی شامل کر دیں۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام بقی بن مخلد نے ایک ہی حدیث کو ابواب و معانی کا لحاظ کرتے ہوئے متعدد اجزاء میں روایت کیا ہو، جیسا کہ امام بخاری کا طریقہ ہے۔ اس کی تائید علامہ ابن حزمؒ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ امام بقی نے ہر صحابی کی مسند کو فقہی ابواب پر مرتب کیا تھا[1]

معلوم نہیں کہ حدیث کا یہ عظیم دیوان دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود ہے یا نہیں، علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ "تحفۃ الاحوذی" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ مسند بقی بن مخلد کا ایک نسخہ "خزانۂ حرمینہ" (؟) میں موجود ہے[2] لیکن علامہ احمد محمد شاکرؒ رقمطراز ہیں:-

"اس جلیل القدر کتاب کے متعلق ہم نے نہیں سنا کہ وہ اسلامی کتب خانوں میں سے کسی کتب خانے میں موجود ہے۔ ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ یہ کتاب ساری کی ساری ضائع ہو گئی ہے یا اس کے کچھ حصے اندلس کی تباہی سے بچ گئے ہیں"[3]

مشہور مستشرق کارل بروکلمان نے بھی مسند بقی بن مخلد کو کتب مفقودہ میں شمار کیا ہے[4]۔ علامہ احمد محمد شاکر نے علامہ ابن الجوزی کے حوالے سے مسند بقی بن مخلد اور مسند امام احمد کا جو موازنہ کیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ ابن الجوزیؒ نے مسند بقی کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ علامہ ابن الجوزی (المتوفی ۵۹۷ھ) کے زمانے میں بلادِ مشرق میں مسند بقی بن مخلد کے نسخے موجود تھے۔ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے مسند بقی کا مطالعہ نہ کیا ہو، اور اُن کی نظر ابو محمد عبداللہ بن یونس کی کتاب "الاعداد" یا اسی قسم کی کوئی دوسری کتاب گذری ہو۔ پچھلے صفحات میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ طاہر بن عبدالعزیز بن عبداللہ قرطبیؒ نے جب بلادِ مشرق کا سفر کیا تو اُن کے پاس مسند بقی بن مخلد کی ایک جلد تھی۔ اس سے جہاں اس بات پر دلیل ملتی ہے کہ مسند بقی بن مخلد کے اجزا بلادِ مشرق میں آتے رہے ہیں، وہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ علماء کی نظر میں مسند بقی بن مخلد کا مرتبہ بہت بلند تھا، اور علماء سفر تک میں بھی اس جلیل القدر کتاب کو ساتھ رکھتے تھے۔

(باقی)

---

[1] الباعث الحثیث، ص ۱۸۵ تا ص ۱۸۸

[2] مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری۔ طبع بیروت ص ۱۶۴

[3] الباعث الحثیث ص ۱۸۶

حضرت امام احمد بن حنبلؒ

جناب عبد الرشید عراقی

نام ونسب نام احمد بن محمد بن حنبل، کنیت ابو عبد اللہ ۔ ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے ۔ تین سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔

تحصیلِ علم بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا ۔ بغداد جیسے حضرت امام کے مولد و مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے ۔ وہیں سب سے پہلے آپ نے تعلیم حاصل کی ۔ بغداد خلافتِ عباسیہ میں بہت بڑا علم و فن کا مرکز تھا ۔ اس کے بارے میں محدث حاکم نیشا پوری فرماتے ہیں " بغداد مدینۃ العلم " اور " موسم العلماء والافاضل " ہے[1] ۔

بغداد میں آپ کے استاد حضرت امام ابو یوسفؒ ، اور امام حدیث ہیثم بن بشیر بن ابو حازمؒ الواسطی م ۱۸۳ھ ہیں ۔ ان کے علاوہ دیگر محدثین کرام سے بھی استفادہ کیا ۔ بغداد سے فارغ ہو کر کوفہ ، بصرہ ، مکہ ، مدینہ ، یمن ، شام اور جزیرہ کا سفر کیا اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے علم حاصل کیا[2] ۔

۱۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی ملاقات حضرت امام شافعیؒ سے ہوئی ۔ امام احمدؒ اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے ۔ امام شافعیؒ حدیث کے صحت و سقم کے بارے

---

[1] معرفۃ العلوم الحدیث ص ۱۹۴

[2] مناقب الامام احمد بن جوزی ص ۲۲

میں اکثر اُن پر اعتماد کرتے۔ فرماتے کہ اگر محدثین کے یہاں حدیثیں صحیح ہوں تو تم مجھے بتلا دیا کرو، میں اُن کو اختیار کروں گا۔

حضرت امام احمدؒ بن حنبل کا حافظہ قوی تھا۔ دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔ اس وسعتِ علم اور کثرتِ حفظ کے باوجود حضرت امام شافعیؒ کی شخصیت سے متاثر تھے اور کہتے تھے "مَا رَأَتْ عَيْنَايَ مِثْلَهُ" (میری آنکھوں نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا)۔ اور حضرت امام شافعیؒ امام احمدؒ بن حنبل کے بارے میں فرماتے ہیں:

خرجتُ من بغداد وما خلفتُ بها أتقى ولا أفقه من أحمد بن حنبل[1]

ترجمہ:۔ میں بغداد کو چھوڑ رہا ہوں۔ اس حالت میں کہ وہاں احمدؒ بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے، نہ کوئی فقیہ۔

مجلسِ درس | چالیس سال کی عمر میں (غالباً ۲۰۴ھ) انہوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ یہ بھی اُن کا کمال اتباعِ سنت تھا کہ انہوں نے عمر کے چالیسویں سال، جو سنِ نبوت ہے، علمِ نبوت کی اشاعت شروع کی۔ ابتداء ہی سے اُن کے درس میں سامعین وطالبین کا اژدحام ہوتا تھا۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ اُن کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی۔ ان میں پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے۔ اُن کی مجلسِ درس بڑی سنجیدہ اور باوقار ہوتی تھی[2]

زہد وتقویٰ | امام صاحب کی زندگی زہد وتوکل میں یکتائے روزگار تھی۔ انہوں نے کبھی بھی سلاطین و امراء کے عطیات قبول نہیں کیے۔ مامون، معتصم، اور واثق کا دور اُن کے لیے اس حیثیت سے آزمائش تھا کہ یہ تینوں اُن کے درپئے آزار رہے۔ ان کے بعد متوکل کا دور اس لیے آزمائش تھا کہ وہ ان کا نہایت عقیدت مند اور قدر دان تھا۔ امام صاحب نے متوکل کے حکم سے اس کے لشکر میں قیام فرمایا۔ اس عرصہ میں شاہی مہمان تھے۔ روزانہ پُر تکلف کھانا آتا۔ مگر امام صاحب نے اس کھانے کو کسی روز

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۸

[2] حلیۃ الاولیاء جلد ۹ ص ۱۶۵

بھی نہیں چکھا۔ وہ مسلسل روزہ رکھتے۔ یہاں تک کہ اتنے ضعیف اور کمزور ہو گئے کہ اگر اُن کو رخصت نہ ملتی تو شاید زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے [۱]

ایک مرتبہ مصر کے ایک کرم فرما نے ہزاروں دینار یہ کہہ کر بھیجے کہ یہ بالکل حلال ترکۂ میراث ہے، اس کو قبول فرمائیے اور اپنے بچوں پر خرچ کیجیے۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔

گرچہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم
گر بآبِ چشمۂ خورشید دامن تر کنم

تواضع و مسکنت مسئلۂ خلقِ قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالمِ اسلام اُن کی شہرت سے معمور ہو گیا اور ہر طرف اُن کی تعریف اور دعا کا غلغلہ تھا۔ مگر وہ برابر اللہ سے خائف رہتے۔

امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں:-

"میں نے امام احمدؒ جیسا نہیں دیکھا۔ میں پچاس برس اُن کے ساتھ رہا۔
انہوں نے کبھی ہمارے سامنے اپنی صلاح وخیر پر فخر نہیں کیا۔" [۲]

شیوخ و تلامذہ حافظ ابن جوزی نے آپ کے شیوخ کی تعداد سو سے زیادہ بتائی ہے جیسے امام ابو یوسفؒ، ہیثم بن بشیر بن حازم، وکیع، یحییٰ بن سعید، قطان، سفیان بن عیینہ، امام شافعیؒ وغیرہ۔

ان کے تلامذہ کے متعلق حافظ ذہبی نے تذکرہ (جلد ۵ - ص ۸) میں لکھا ہے کہ "بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابوزرعہ، لطیف و عبداللہ بن احمد وخلق عظیم"

خلقِ عظیم (یعنی کثیر التعداد خلقت) کے الفاظ سے ان کے تلامذہ کی کثرتِ تعداد کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان میں بڑے بڑے ائمۂ فن شامل ہیں۔

امام احمد ابتلاء و امتحان میں ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اُن کے ابتلاء کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے۔ کیونکہ خلقِ قرآن کے مسئلہ میں انہوں نے غیر معمولی استقامت کا ثبوت دیا۔ بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں معتزلہ کا زور تھا۔ اور معتزلہ نے اس مسئلے کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا تھا۔ وقت کا

---

[۱] طبقات الحنابلہ
[۲] حلیۃ الاولیاء۔ جلد ۹ ص ۱۸۱

فرمانروا مامون بھی اس مسئلہ کا پرجوش داعی بن گیا۔ اور اس کے ساتھ قاضی احمد بن دُؤاد بھی شامل ہو گیا۔

ابتداء میں بہت سے علمائے کرام نے نظریۂ خلقِ قرآن کی مخالفت کی۔ حکومت کی طرف سے سختی سے نوٹس لیا گیا۔ کئی علماء حکومت کی سختی برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے حکومت کی بات مان لی۔ مگر امام احمد بن حنبل آخر تک ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جب حکومت ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر چکی اور اُس کو کسی قسم کی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو پھر وہ انتہائی تشدد پر اتر آئی۔

حضرت امام کو دربار کے حکم سے کوڑے لگائے گئے۔ ایک تازہ دم جلّاد صرف دو کوڑے لگاتا، پھر دوسرا جلّاد بلایا جاتا۔ امام احمدؒ ہر کوڑے پر فرماتے۔

اعطونی شیئًا من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہٖ۔

ترجمہ: میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اُس کے رسول کی سنّت میں سے کوئی دلیل پیش کرو۔ تاکہ میں اُس کو مان لوں۔

امام احمد کو ۲۸ ہفتے قید خانے میں رکھا گیا۔ اور اس عرصہ میں اُن کو ۳۴ کوڑے لگائے گئے۔[1]

امام محمدؒ بن اسمٰعیل بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے سنا کہ امام احمد بن حنبل کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی کو لگتا تو چیخ مار کر بھاگتا۔ امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اور امتِ اسلامیہ ایک بہت بڑے دینی خطرے سے محفوظ ہو گئی۔ ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و امامت کا اصل راز دین کی حفاظت کے لیے اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہت کا تنہا مقابلہ ہے۔[2]

حضرت امام علی بن مدینی جو مشہور محدث اور امام بخاری کے مایۂ ناز استاد ہیں۔ انہوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی۔ فرماتے ہیں کہ:۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۳۳۴ د تاریخ دعوت وعزیمت بحوالہ تاریخ اسلام از ذہبی۔

[2] تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۴۱۸

ان اللہ اعز ھذا الدین برجلین لیس لہ ثالث۔ ابوبکر الصدیق یوم الردۃ و احمد بن حنبل یوم المحنۃ۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کے غلبہ و حفاظت کا کام دو شخصوں سے لیا ہے جن کا تیسرا ہمسر نظر نہیں آتا۔ ارتداد کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور فتنہ خلق قرآن کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبل رحؒ[1]

تصنیفات صاحب کشف الظنون نے امام صاحب کی درج ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے:۔

۱۔ کتاب الزہد۔ ۲۔ کتاب الناسخ والمنسوخ۔ ۳۔ کتاب التمسک الکبیر۔ ۴۔ کتاب التمسک الصغیر ۵۔ کتاب حدیث شعبہ ۶۔ کتاب فضائل الصحابہ۔ ۷۔ مناقب صدیق اکبر و حسنین، ۸۔ کتاب الاشربہ۔ ۹۔ تاریخ تفسیر۔ ۱۰۔ مسند احمد بن حنبل۔

ان کی یہ تصانیف بڑی علمی و تصنیفی کارنامہ ہیں۔

مسند احمد کی تالیف مسند آپ کی زیادہ مشہور کتاب ہے۔ ۱۸۰ھ میں اپنی تصنیف کا آغاز کیا۔ اور آخر زندگی تک اس کی تصنیف میں مشغول رہے۔ مسند میں تقریباً ۷۰۰ صحابہ کی روایات ہیں۔ روایات کی تعداد تیس ہزار بتائی گئی ہے۔ عبداللہ کی زوائد کا شمار کیا جائے تو تعداد چالیس ہزار بن جاتی ہے جتنا بڑا احادیث کا یہ ذخیرہ ہے، اس سے بڑا اور کوئی ذخیرہ نہیں[2]

اجتہاد اور فتویٰ کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحؒ کا نقطہ نظر اجتہاد و فتویٰ کے بارے میں ان کے سامنے پانچ بنیادی اصول رہے:۔

۱۔ جب نص صحیح موجود ہو تو پھر بڑے سے بڑے صحابی کے اختلاف کے باوجود نص پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ کئی مسائل میں انہیں حضرت عمر رضؓ سے اختلاف کرنا پڑا۔ جیسے مہر کا معاملہ ہے۔ اس میں فاطمہ بنت قیس کی روایت واضح ہے۔ اسی طرح جُنبی کے تیمم کے باب میں وہ عمار بن یاسر کی روایت کردہ حدیث کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ مسئلہ کہ محرِم نے اگر احرامِ مکہ سے پہلے خوشبو استعمال کی ہے اور

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۴۱۸

[2] تدریب الراوی ص ۴۰ و طبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد ۱ ص ۲۰۲

کے اثرات قائم رہتے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضؓ سے ان معنوں میں حدیث موجود ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے اس فتوے سے انہوں نے اختلاف کیا کہ حاملہ جس کا خاوند مر چکا ہو، اُس کی عدت اقصی الاجلین ہے، کیونکہ اُن کے نزدیک سبیعۃ الاسلمیہ کی حدیث زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ ٹھیک اسی نہج کی مخالفت توریثِ مسلم از کافر کے باب میں انہیں حضرت معاویہ رضؓ اور حضرت معاذ رضؓ سے ہے۔ یہ دونوں بزرگ اس کے قائل نہیں۔ اور امام چونکہ اُس حدیث کو صحیح مانتے ہیں جس میں اُن کی مخالفت کا تذکرہ ہے اس لیے اس کے قائل نہیں ہو سکتے۔ غرض نصِ صریح کے ہوتے ہوئے امام نے کبھی مختلف آرا کی طرف نظر اُٹھا کے نہیں دیکھا۔ حدیث کے مقابلہ میں قیاسات و آرا، کو اہمیت نہیں دی، اگرچہ عام لوگ انہیں اجماعِ امت سے تعبیر کریں۔ کیونکہ اس میں حقیقت صرف اتنی ہوتی ہے کہ ہمیں اختلاف کا علم نہیں ہو پاتا۔ یعنی ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ہمیں اُن لوگوں کے متعلق کوئی علم نہیں ہوتا جنہوں نے اختلاف رائے کیا ہو۔ لہٰذا نصوص کے ہوتے ہوئے ہمیں دوسرے کی رائے کو نہیں دیکھنا چاہیے۔

۲۔ انہیں جب کسی صحابی کی رائے معلوم ہوتی اور یہ نہ معلوم ہو پاتا کہ کون کون اس کا مخالف ہے تو صرف اس قدر فرماتے کہ اس مسئلہ میں فلاں صحابی یا صحابہ کی رائے یہ ہے، اس کی مخالفت معلوم نہیں۔ اس پر اجماع کا دعویٰ نہ کرتے۔ پھر اس کو ہر رائے اور ہر قیاس پر مقدم ٹھہراتے۔

۳۔ جب مختلف صحابہ کی آرا سامنے آتیں تو اُن میں سے جو کتاب و سنّت کے اقرب رائے ہوتی اُسے قبول فرماتے۔ ہر آئینہ اپنے کو صحابہ کے اقوال میں محصور رکھتے۔ پھر اگر کسی مسئلہ میں موافقت واضح نہ ہوتی تو احتیاط سے کام لیتے۔ اور کسی قول کو قطعی نہ سمجھتے۔

۴۔ مرسل کو حجت گردانتے۔ اسی طرح ضعیف حدیث سے بھی استدلال کرتے، جب کہ کوئی اور مانع نہ ہو۔ اُسے قیاس پر مقدم ٹھہراتے۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ امام کے نزدیک ضعیف حدیث سے مُراد منکر یا باطل نہیں ہے بلکہ وہ قریب قریب حَسَن کے مترادف ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک احادیث کی تقسیم یُوں ہے کہ یا تو وہ صحیح ہیں یا ضعیف، درمیانی مراتب مفقود ہیں۔ اِس لیے جو مرتبۂ علیا کی حدیث ہے وہ صحیح ہے اور جو مرتبے میں اس سے کم ہے وہ ضعیف ہے۔ وہ اس کو اس شرط کے ساتھ حجت مانتے ہیں کہ اس کی مخالفت میں کسی صحابی کا قول یا اثر نہ ہو۔ اس باب میں دوسرے ائمہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

جیسے امام ابوحنیفہؒ کہ انہوں نے بعض مقامات پر اُن ضعاف سے استدلال فرمایا ہے جن کے ضعف پر ائمہ حدیث متفق ہیں جیسے قہقہہ فی الصلوٰۃ کی حدیث یا نبیذِ تمر سے وضو کی حدیث یا مثلاً ایام حیض کی تحدید کے متعلق یہ تصریح کہ " اکثر الحیض عشرۃ ایام " (ترجمہ: مدتِ حیض دس دن ہوتی ہے) یا مہر کے تعین سے متعلق یہ حدیث کہ " لا مھر اقل من عشرۃ دراھم " (ترجمہ- دس درہم سے کم مہر نہیں)۔

۵- قیاس و اجتہاد کو اس وقت کام میں لاتے جب یہ دیکھتے کہ اب اس کے سوا چارہ نہیں ہے یعنی پہلے نصوص کو ٹٹولتے اور پھر صحابہ کے اقوال کی جستجو ہوتی - مرسلات و ضعاف تک کو قیاس پر مرجح سمجھتے - پھر جب دیکھتے کہ بغیر قیاس و رائے کے اب مسئلہ نہیں سلجھتا تو پھر اس کو استعمال کرتے - اکثر فرماتے کہ میں اس معاملے میں شافعی کا پیرو ہوں - اُن سے سبب دریافت کیا گیا کہ قیاس و رائے استعمال کرنا چاہیے تو انہوں نے فرمایا کہ " انما یصار الیہ عند الضرورۃ " یعنی جب اور کوئی صورت باقی نہ رہے، تب اس کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔[1]

مناقب حضرت امام کے مناقب پر علماء نے بڑی بڑی کتابیں لکھیں - آپ ایک بلند پایہ فقیہ، محدث، مجاہد، زاہد، مرتاض، عاملِ سنتِ نبوی تھے -

مسلک ان کا مسلک کتاب و سنت کے نقطۂ نظر سے اتنا اقرب، اتنا صحیح اور قیاس و رائے کو اتنا کم لیے ہوئے ہے جس کی مثال دوسروں میں نہیں ملتی -

دوسری خصوصیت اُن کی بے نظیر عزیمت ہے کہ مسئلہ خلق قرآن میں باوجود جلالتِ قدر کے تذلیل و تعذیب کی تمام صورتوں کو گوارا کیا - لیکن جس کو حق سمجھتے تھے اُس پر جمے رہے، اس سے دستکش نہیں ہوئے -

وفات ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ کو امامِ سنت نے انتقال کیا - آپ کی نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں اور اُن کی وفات کے موقع پر بیس ہزار غیر مسلم اسلام کی چوکھٹ پر جھک گئے۔[2]

---

۱ ملخص از امام احمد بن حنبل از شیخ ابوزہرہ مصری -

۲ تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۸

مغربی تہذیب کا بحران

جناب ریاض الحسن نوری صاحب

(ماہ اپریل سے آگے)

امریکی اعلان آزادی کا مصنف امریکہ میں بڑے بڑے لوگوں کی لونڈیوں سے پیدا شدہ اولاد کو قحبہ گری کے لیے فروخت کیا گیا - امریکی اعلانِ آزادی کے مصنف صدر جیفرسن کی موت کے بعد اُن کی لڑکیوں سے بھی یہی سلوک ہوا - جیفرسن نے اپنی اس اولاد کو جو افریقی النسل لونڈیوں سے تھی اپنی آخری وصیت میں آزاد قرار دے دیا تھا - مگر اس کے باوجود اس کی موت کے بعد اُس کی دونوں لڑکیوں کو فی کس پندرہ سو ڈالر کے حساب سے قحبہ گری کے لیے فروخت کر دیا گیا - یہ دونوں لڑکیاں سفید فام اور نیلی آنکھوں والی تھیں اور دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھیں - چھوٹی لڑکی قحبہ گری سے بچنے کے لیے اپنے مالک کے پاس سے بھاگ آئی اور خودکشی کر لی - امریکن قوم نے یہ سلوک اپنی آزادی کے اعلان کے مصنف کی بیٹیوں کے ساتھ کیا[۱]

پریذیڈنٹ ٹیلر کی بیٹی بھی اسی طرح بیچ دی گئی - اس کا قصہ یوں ہے کہ اس کی ایک بیٹی اپنے پسندیدہ لڑکے کے ساتھ شادی کرنے کی خاطر اس کے ساتھ بھاگ گئی - آخرکار دونوں پکڑے گئے - اس پر اس کے باپ نے خود اپنی لڑکی کو ایک لونڈیوں کے سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا - واشنگٹن

---

[۱] مؤلف مضمون اگر یہاں یہ تذکرہ بھی کر دیتے تو اچھا تھا کہ امریکی صدر اور دوسرے اکابر میں سے کتنے حرام اولاد تھے (مدیر)

کے بازار تماشہ سے ایک دوسرے شخص نے اس کے حُسن کی وجہ سے اُسے ۲۵۰۰ ڈالر میں خرید لیا۔ یہ سزا اس کو محض اس وجہ سے دی گئی کہ وہ اپنی مرضی کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ امریکہ کے صدر تک کی لڑکی کو یہ حق حاصل نہ تھا[1]

غرضیکہ بالکل جدید دور سے پہلے تک یورپ میں قحبہ گری بہت عام تھی۔ انیسویں صدی کے اعداد و شمار اِس کتاب میں مفصل دیے گئے ہیں۔ ہم اتنا حوالہ یہاں دیے دیتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء میں نیویارک شہر میں ہر چالیس آدمی کے بالمقابل ایک طوائف موجود تھی[2]

آج کے مغرب کا کیا حال ہے۔ مثال کے طور پر برٹرینڈ رسل کا بیان سُن لیجیے۔

"تمام امریکہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد جو بعد میں شادی کر لیتی ہیں اور اونچی سوسائٹی میں شامل ہو جاتی ہیں، شادی سے پہلے کئی عشاق سے جنسی تعلقات قائم کر چکی ہوتی ہیں[3]"

اس عام بدکاری کی وجہ سے جنسی امراض اب پیشہ ور عورتوں کی نسبت دیگر عورتوں کے ذریعے زیادہ پھیل رہے ہیں[4]۔ مگر اس پر ہم الگ سے کلام کریں گے۔

اس بدکاری میں روس بھی امریکہ و دیگر مغربی ممالک سے زیادہ پیچھے نہیں ہے۔ اس کی تفصیلات بھی بینجمین صاحب نے اپنی کتاب میں دی ہیں مگر ہم طوالت کے خوف سے اِسے نظرانداز کرتے ہیں۔ رُوس میں رضامندی سے بدکاری پر کوئی قدغن نہیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۴ء میں باقاعدہ قانون بنا دیا گیا جس کی رُو سے بن بیاہی ماں کو بُرا کہنے والے کو سزا دی جاتی ہے[5]۔

جی۔ ایل۔ سائمنز G. L. Simons اپنی کتاب سیکس اِن ہسٹری کے صفحہ ۱۶۴

1. P. 63, 64. Ibid
2. P. 73 Ibid.
3. P. 107 Marriage and Morals by Bertrand Russell.
4. P. 352 Prostitute in Society.
5. USSR Questions and Answers P. 109, Published in Moscow.

پہ لکھتا ہے کہ امریکہ میں بڑی تجارتی فرمیں اپنی بکری بڑھانے اور بڑے تجارتی سودوں کے لیے کال گرلز استعمال کرتی ہیں۔ پھر صفحہ ۱۶۵ پہ لکھتا ہے کہ امر واقعہ یہ ہے کہ بڑے کاروبار اور قحبہ گری توام ہیں (Here is the fact . . . . Big Business and Prostitution are Intertwined)

پھر یورپ میں عورتوں کو جس طرح سے جاسوسی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہ بھی بڑی لرزہ خیز حقیقت ہے۔ ۱۹۷۶ء میں لندن سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام جاسوسی بذریعہ جنس Sex Pionage ہے۔ اس کا مصنف ڈیوڈ لیوس David Lewis ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ روس میں ذہین اور حسین لڑکیوں کو حکومت اعلیٰ ملازمت اور بڑی تنخواہ کا لالچ دے کر تعلیم گاہوں سے ہٹا لیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ اُن کو شرمناک جنسی ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ وہ غیر ملکیوں کو اپنے شکنجے میں پھنسا کر ان سے اہم معلومات حاصل کریں۔ ان لڑکیوں کے ذریعے سیاستدانوں کو بلیک میل کیا جاتا ہے۔ جن خاص ہوٹلوں میں یہ لڑکیاں اپنے شکار کو لے جاتی ہیں، ان میں کیمرے اور الیکٹرانک آلات فٹ ہوتے ہیں۔ روس کے سب سے بڑے بڑے ہوٹلوں میں ایسے کمرے موجود ہیں۔ جدید دور کی تمام مغربی حکومتوں کو اپنے اقتدار کی خاطر ذلیل سے ذلیل حرکتیں کرنے اور اپنے ملک کی خواتین کی عصمتیں لٹانے میں کوئی باک نہیں۔ عورتوں کے علاوہ مردوں کو بھی جنسی ٹریننگ دی جاتی ہے اور اُن کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان کو حیوان سے بھی بدتر بنا دیا گیا ہے۔ سٹیٹ یا اقتدار کو خدائی مقام دے دیا گیا ہے جس کے سامنے عوام کی ہر طرح سے قربانی دی جاتی ہے۔ عوام کی جان و مال حتیٰ کہ عزت اور عصمت کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی۔ سب کچھ کرسی پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ حکومت کو کرسی مضبوط کرنے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے تو طرح طرح کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ کاسمیٹکس پر ٹیکس، شراب اور تمباکو پر ٹیکس وغیرہ وغیرہ۔ سگریٹ سے کینسر اور کئی دوسری بیماریاں اگر پھیلتی ہیں تو حکومت کو پروا نہیں بلکہ ٹی۔ وی پر اشتہار دکھا کر اس عادت کو پھیلایا جاتا ہے۔ عظیم قدوائی ۱۲ جنوری کے ڈان میں لکھتے ہیں کہ سگریٹ سے حکومت کو اس قدر آسانی سے اور کافی ٹیکس وصول ہوتا ہے کہ تہذیب یافتہ سوسائٹیوں کا وزیر خزانہ ہر چیز کے لیے تیار ہو سکتا ہے مگر اس کے لیے نہیں کہ سگریٹ نوشی ختم

ہو جاتے تھے۔

ٹیکس پر شروعات

یورپ میں ٹیکسوں کی شروعات کو سمجھنے کے لیے ٹیلر کا مندرجہ ذیل بیان اہم ہے۔ وہ چرچ کے جنسی قوانین کی بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ قوانین اخلاقی وجوہات کی بنا پر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ پس منظر یہ تھا کہ چرچ کی نظر میں پادری کے لیے نکاح کرنا داشتہ رکھنے سے بدتر جرم تھا۔ اور داشتہ رکھنا بے لگام بدکاری سے بدتر تھی ـــــ یہ نظریہ عام اخلاقی نظریے کا بالکل الٹ ہے جس میں کہ قانونی رشتہ کے دوام کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جب پادریوں پر شادی کرنے کا الزام لگایا جاتا تو ان کے بچاؤ کا آسان طریقہ یہ تھا کہ یہ کہہ دیا جائے کہ یہ تو محض بے لگام بدکاری تھی۔ اس کا جرمانہ معمولی تھا۔ دوسری طرف شادی کی سزا عہدے سے مکمل برخاستگی تھی۔ پادریوں کی بدکاریوں کے واقعات کو اس پس منظر کو دیکھنا چاہیے کہ بہت سے بچے راہباؤں کے پیدا ہوتے۔ ان سے ہمیں زیادہ حیرانی نہیں ہوتی، جتنی کہ ہمیں جانوروں سے بدکاری کی افواہوں سے ہوتی ہے یا راہباؤں کی دیکھ بھال کرنے والوں کے اس قول سے ہوتی ہے کہ راہباؤں کو اپنے پالتو جانور ہٹا دینے چاہییں۔ ان حالات میں بچاؤ کا یہ طریقہ استعمال کیا گیا کہ پادری حضرات گناہ کی زندگی گزارنے کا لائسنس حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ پوپ کے آفس (CURIA) کو خاصی رقم دے دیا کریں۔ اس اقدام کو ترقی کی طرف قدم ہی کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چرچ سیج مچ برائیوں کی ہمت افزائی میں آگے بڑھ گیا۔ ایک فیوڈل لارڈ نے جب یہ دیکھا کہ اس کے مزارعین جرمانے ادا کرنے کی وجہ سے اس کو پورا لگان ادا نہیں کر پاتے تو اس نے مزارعین کو سختی سے حکم دے دیا کہ وہ چرچ کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کریں۔ چنانچہ لارڈ کے دباؤ کی وجہ سے چرچ کے قوانین کی خلاف ورزی تقریباً بند ہو گئی۔ اُدھر چرچ والوں نے جب دیکھا کہ چرچ کے قوانین کی پابندی کی وجہ سے مزارعین کی طرف سے جرمانوں کی آمدنی کم ہو گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کے خلاف احتجاج کیا کہ یہ مذہب میں خلل اندازی ہے۔ چودھویں صدی تک یہ سارا سلسلہ کمرشل بن گیا اور نہ صرف یہ کہ ہر شخص رقم کے ذریعے گناہ کرنے کی اجازت حاصل کر سکتا تھا۔ بلکہ گناہوں کے کفارہ کے طور پر کرایہ کے آدمیوں پر رقم خرچ

ہو جائے اور مقدس مقامات کی زیارت کرا کے اپنے گناہوں کی معافی بھی حاصل کر سکتا تھا۔[1]

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مغرب میں بدکاری، قحبہ گری، جوئے بازی، شراب خواری، سگریٹ نوشی، فلم بینی، تھیٹر بینی وغیرہ سے حاصل ہونے والے تفریحی اور دوسرے ٹیکس کیسے شروع ہوئے۔ حکومتیں بھی پادریوں کی نقالی میں کہنے لگیں کہ تم بے شک برائیاں کر کے اپنے آپ کو تباہ و برباد کرتے رہو، ہماری بلا سے، مگر جب تک ہمیں ٹیکس دیتے رہو گے ہم تمہاری بربادی، تباہ کاری اور خودکشی سے متعرض نہ ہوں گے۔ ہماری جیبیں بھرتے رہو، پھر سود خواری، فحاشی، ناچ، جوئے، شراب و سگریٹ سے بےشک قوم کے اخلاق خراب اور ان کی نسلیں برباد کرتے رہو، ہماری طرف سے کھلی اجازت ہے، ہم تم کو ہر برائی کے لیے اجازت نامے یعنی لائسنس بھی دیں گے۔ غرضیکہ یہ ٹیکس گویا ایک طرح کی رشوت تھی۔ جس کو وصول کر کے فحاشی، جوئے اور دیگر ذرائع سے اخلاق باختہ لوگوں کو چھوٹ دی گئی کہ وہ عوام کو لوٹیں اور ان کو اور ان کی نسلوں کو زندہ درگور کرتے رہیں۔ یہ ہے مغربی جمہوریتوں میں ٹیکس و انکم ٹیکس کی نفسیات اور ان کے تحت الشعور کے دھند میں چھپی ہوئی نیت۔ یہ سب ٹیکس حقیقت میں رشوتیں ہیں جو افسروں کے بجائے خود حکومت وصول کرتی ہے اور یہ سبق انہوں نے پادریوں سے سیکھا ہے۔ اگرچہ چرچ کے قانون کے مطابق سود حرام ہے، مگر اپنے فائدے کی غرض سے چرچ نے سود میں خود بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ المختصر مذکورہ بالا طریقوں سے چرچ نے سود میں زیادہ دولت کمائی یا دوسرے لفظوں میں عوام کو دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹا۔

برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ "جو ریونیو انگلینڈ سے لے کر جرمنی تک کے ممالک سے روم پہنچتا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا، جو کبھی قدیم رومی فوجیں لوگوں سے چھین سکی تھیں۔ مگر یہ دولت اس تقدس کی بنا پر حاصل کی جاتی تھی جو عوام پاپائیت کے لیے محسوس کرتے تھے نہ کہ اسلحہ کے بل بوتے پر"۔[1]

واضح رہے کہ چودھویں صدی میں انگلینڈ میں چرچ کا ٹیکس حکومت سے پانچ گنا تھا۔[2]

(باقی)

---

1. P. 67, 68. Sex in History by G. Rattray Taylor.

1. P. 45. Power by Bertrand Russell.
2. P. 13. The World's Greatest Scandals by Charles Franklin.

جُدا ہونے والوں کا تذکرہ

(اِدارہ)

ابھی جانِ زارِ اسلام کے ایک جہاد کیش خادم خواجہ عبدالوحید اور جواں سال وحید اللہ نلمی کے اندوہ ہی سے عہدہ برآ نہ ہو پائی تھی کہ اس ماہ میں دو گراں قدر قریبی رفیق ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ پہلے تو قدرت کا بلاوا حکیم اقبال حسین صاحب کے نام آیا۔ وہ چلتے پھرتے، کام کاج کرتے، ہنستے بولتے یکایک مادی زندگی کی سرحد کو پار کر گئے۔ قریبی دوستوں نے محسوس کیا کہ ابھی تھے، ابھی نہیں۔

ہمارے دیرینہ اور مجھ سے بزرگ تر رفیق تھے۔ خدا نے انہیں ہر قسم کی قابلیتیں دی تھیں۔ لکھنے، تقریر کرنے، گفتگو کرنے اور انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لحاظ سے وہ ایک مقام رکھتے تھے۔ بعد کے دور میں اختصاص کا مستحق انہوں نے طب کو قرار دیا۔ بنیادی حیثیت یونانی طب کو دیتے ہوئے دوسرے ہر طریق علاج سے انہوں نے بے تعصبی کے ساتھ استفادہ کیا۔ انگریزی لٹریچر پڑھا۔ معالجۂ امراض کے لیے جدید ورزشوں کا مطالعہ کیا۔ یوگا کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ پانی اور دوسرے قدرتی ذرائع سے امراض کا مقابلہ کرنے کے علاوہ چین کے سوئیوں کے طریق علاج کو بھی جانا، سمجھا اور برتا۔

حکیم اقبال حسین صاحب نے یہ اچھی مثال قائم کی کہ معالج کو علمی لحاظ سے کتنا لمبا سفر طے کرنا چاہیے اور نقطۂ نظر کے لحاظ سے کتنا فراخ دل ہونا چاہیے۔

برادرم اقبال حسین میری دانست کے مطابق شاید کسی کے لیے کبھی باعثِ تکلیف و اذیت نہیں بنے۔ ہر ایک سے یکساں ربط رہا۔ جیل میں بھی ان کے ساتھ دن گذارنے کا موقع ملا اور انہیں

قریب سے دیکھا۔

حکیم صاحب کی طبیعت میں مزاح تھا اور خاص خاص لطائف بڑے انداز سے، مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ جیل کے زمانے میں انہوں نے کالج کے ڈریس شو میں ایک سادھو مہنت کا پیرایہ اختیار کیا۔ کئی روز پہلے سے ایک خاص ادا رکھنے والے سادھو مہنت سے وہ بول سیکھے جو وہ چلتے پھرتے بولتا تھا۔ اُس کا سا لباس بنوایا۔ اُس کی شاگردی کی اور کچھ مشقیں کیں۔ پھر جب وہ سادھو مہنت کے بھیس میں اس کا سا جاپ کرتے ہوئے کالج کے اندر سے جانے والے ایک راستے سے گزرے (جہاں سے وہ سادھو مہنت گزرا کرتا تھا) تو وہ پرنسپل کے سامنے سے اور طلبہ کے ہجوم میں سے ہو کر نکلے تو کوئی انہیں پہچان نہ سکا۔ بعد میں وہ پھر پرنسپل کے سامنے پہنچے اور سلام کیا۔ تب اُس نے کہا کہ "ہیں! اقبال! یہ تم تھے!" ۔۔۔ وہ مقابلے کا انعام وہ جیت لے گئے۔ اس معمولی واقعہ سے مرحوم کے کردار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک تفریحی مقابلے کے لیے کس محنت سے تیاری کی۔

یہی محنت و کاوش آگے چل کر انہوں نے تحریک اسلامی کے فروغ میں صرف کی، اور اسی مدعا کے لیے یکسو رہ کر پوری عمر گزار دی۔

ع "اے خوشا عمرے کہ رفت اندر نیاز"

اب وہ شخص اِس دُنیا میں نہیں رہا ہے۔ محض اُس کی یادیں ہمارے پاس رہ گئیں۔ اور اس کے اعمال ایسے تھے کہ انشاء اللہ خدا کی نگاہ کرم ہو تو اُس کی پوری زندگی کی سفارش اُسے بخشوانے کے لیے کافی ہو گی۔ پھر بھی ہزاروں انسانوں کے ساتھ راقم بھی اس کے لیے دل سے دُعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تحریک اسلامی کے اُس سنجیدہ و شائستہ، اور نیک دل اور صاف باطن خادم کی کمزوریوں اور لغزشوں سے درگذر فرمائے اور اُس کے اعمالِ حسنہ کو قبول فرما کر اُس کی رُوح کو انوارِ رحمت سے بہرہ مند کرے۔

اُن کے اہل وعیال پر بھی خدا فضل خاص فرمائے اور اُن میں سے دین کی خدمت کرنے والے افراد کو اُٹھائے جو حکیم صاحب کے سچے جانشین ہوں۔

حکیم صاحب کے بعد، ہماری صفوں میں سے مولانا ولی اللہ (سیرلاہور کی جماعت سے وابستہ تھے)، اُٹھ گئے۔ سوچتا ہوں کہ کیا ہی نیک نہاد شخصیت تھی۔ اکثر خاموش رہتے۔ بات کرتے تو کسی کے لیے وجہ دل آزاری نہ بنتے، ہمیشہ دین اور رفیقوں کی خیر خواہی اُن کے قول و فعل میں جھلکتی۔

بارہا لاہور کے اجتماعات میں مولانا ولی اللہ کا درس ہوتا۔ قرآن یا حدیث کا درس۔ سیدہا دوستوں نے اُن سے استفادہ کیا ہو گا۔ ایک اسکول میں معلّم تھے۔ وہاں بھی قوم کے نونہالوں کو ایمان اور علم کے نُور سے بہرہ مند کرتے رہے۔

نہایت سادہ زندگی، چھوٹا سا مکان، تھوڑی سی آمدنی۔ مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پہ نہ آیا۔ بیشتر اُن کو مُسکراتے دیکھا۔ گھر کے ساتھ ہی مسجد تھی۔ گھر سے اُٹھتے تو مسجد میں۔ کئی بار اجتماعات اسی مسجد میں ہوتے رہے۔

مجھے نہیں یاد کہ اُنہوں نے کبھی اجتماعی معاملات اور فیصلوں میں کوئی بڑا اختلاف کیا ہو، یا لوگوں سے بحثیں کی ہوں، کسی کو بُرا اور کسی کو بھلا کہا ہو۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ خدا کے اس سچے پرستار نے ایک بار بس خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا کہ ایک دعوت حق ہے، ایک جماعت صحیح اُصولوں پہ کھڑی ہے، اس کے سامنے قرآن کا مقرر کردہ نصب العین ہے تو پھر نہ انہوں نے کبھی نظم میں فرق آنے دیا، نہ تدابیر و مصالح کے دائروں میں ہونے والے اختلافات کو انہوں نے کبھی اہمیت دی۔ اس مسافرِ راہ حق نے جس سمت میں پہلا قدم اُٹھایا تھا، اپنی مکمل رفتار کے ساتھ آخری قدم بھی اُسی سمت میں رکھا۔

راقم سے بہت محبت فرماتے اور ہماری معمولی باتوں کی بھی قدر کرتے اور کلام کی غلطیوں سے بھی درگذر کرتے۔

اے ربِّ کائنات! اپنے اس بندۂ مخلص پہ خصوصی رحمتیں فرما۔ ان کے پسماندگان کو صبر بھی دے، اور مولانا مرحوم کی خدمات کے اثر سے خصوصی برکات بھی نصیب کرے۔

اسی سلسلہ میں لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف (کشمیری بازار) کی جدائی پر بھی اظہار غم کرتا ہوں۔ موصوف دین کے پابند اور خادم تھے۔ خاص کارنامہ یہ ہے کہ کئی برس سے انگریزی زبان میں اسلام کے تعارف کے لیے تبلیغی اور معلوماتی لٹریچر شائع کر رہے تھے۔ ان کی مطبوعہ کتب مغربی ممالک میں بکثرت جاتی ہیں۔ بعض مسلم ممالک میں بھی ان کی مانگ ہے۔ مسلمان ان سے معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اور غیر مسلموں میں یہ تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنتی ہیں۔

مرحوم سے کئی بار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مگر وہ ایک مختصر سی ملاقات نہ بھولے گی جب کہ صبح صبح صحنِ حرم میں بیٹھ کر میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اور شیخ صاحب ایک محفلِ درس و وعظ سے کچھ دوسرے احباب کے ساتھ اٹھے۔ مجھے دیکھا تو ادھر چلے آئے۔ چند لمحے اکٹھے رہے۔ پھر وہ اپنے پروگرام کے مطابق چلے گئے اور میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دینی خدمات کی بنا پر ان کی مغفرت فرمائے گا۔ ان کے جملہ لواحقین کے لیے جذبۂ ہمدردی میرے دل میں ہے اور میں سب کے لیے صبر اور اجر کی دعا کرتا ہوں۔ اور یہ آرزو بھی کرتا ہوں کہ شیخ صاحب کی ناشرانہ دینی خدمات کا سلسلہ ان کے بعد بھی اسی طرح جاری رہ سکے۔

دوستو! ان جانے والوں کو دیکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم سب جانے والے ہیں۔ بس دُنیا کی وارفتگیوں اور دولت کے گردابوں اور اسرافیات اور آسائشوں کے چکروں سے اپنے آپ کو نکالو، اور جو لمحے باقی ہیں ان میں خدا کے دین کی اطاعت کر کے اور اس کی دعوت کو اس کے زیادہ سے زیادہ بندوں تک پہنچا کر اور اس کے غلبے کے لیے جہاد کے انداز سے تگ و تاز کر کے اپنی مغفرت کا سامان کر لو۔

خدا مجھے اور آپ سب کو باطل کی یورش کے اس دور میں اپنے ایمان اور اخلاق کا معیار بلند کرنے کی توفیق دے۔

مطبوعات

ماذ ماذ ؐ

ازجناب عبدالعزیز خالد
ناشر: ارمغان اکادمی لاہور
معیار: کاغذ و طباعت بہتر
درمیانی جلد ۱۶۰ صفحات
قیمت : دس روپے

اوّل تو عبدالعزیز خالد اب تعارف وتحسین کی حدود سے آگے نکل گئے ہیں - مزید یہ کہ ترجمان القرآن میں کتابوں کا اجمالی تعارف ہوتا ہے - شاعرانہ کاوشوں پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہوتی - اس وجہ سے ان کی تازہ تالیف (بلکہ ایک نہیں، دو) پر لکھنے میں تساہل ہوتا رہا - یوں بھی کتب تبصرہ کا ڈھیر پہلے سے موجود تھا -

تاہم ہم اجمالی تعارف کراتے ہیں، کتاب کو قارئین خود مطالعہ فرمائیں - یہ نعتیہ کلام کا ایک ہی سلسلہ ہے - خالد صاحب نے اپنے ذوق کے مطابق حضورؐ کے معروف ناموں کے بجائے قدیم نوشتوں سے جو نام برآمد کرکے اب تک پیش کیے ہیں، اُن میں سے ایک "معاذ معاذؐ" ہے - نعتیہ کلام کے اس مجموعے کو خالد صاحب نے کاتب سے لکھوانے کے بجائے "بقلم خود" لکھا ہے - اس میں دلچسپی کا ایک سامان اور پیدا ہوگیا - خالد صاحب کی زبانِ شاعری قدرے اونچی ہے - مثلاً ع "دل مرا تسخیر بے قصوت میں زبان - ہے خنسا" - مگر گذشتہ ادوار میں اُن کے الفاظ زیادہ بھاری ہوا کرتے تھے - اب تو بات یہاں تک آگئی ہے کہ ع "مرا محرم، مرا محبوب، مرا راہ نما" پھر بھی اُن کا رنگ عربیت ضرور اُبھر آتا ہے - مثلاً ع "سلے واسع الصدر و عظیم المنکبین" کہیں ناموں کی انجمن - مثلاً "بُرعی و صرصری، نبہانی و ... کی" - یا "نہ صرصری ہوں، نہ ابنِ رواحہ و بُرعی" - کہیں مشکل قوافی کی لمبی صفیں، مثلاً صفحہ ۱۱۴ کی نعت کے ۶۵ اشعار ہیں - اور قوافی ہیں، محمدؐ، برگد، مسند، خوشامد، آپنش، فرشِ مُمہّد، موئے مجعّد، طبرزد، غرقد، شبِ اربد، مرقد وغیرہ - ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جنّ خالد صاحب کے قبضے میں ہے جو ان کے مطلب کے قوافی یا الفاظ نکال نکال کر ان کے سامنے رکھتا جاتا ہے - یہ تو غنیمت ہے کہ

اس کتاب میں ہندی، سنسکرت، عبرانی، یونانی وغیرہ کے لفظ زیادہ نہیں ہیں۔
اصل کہنے کی بات ایک ہے، وہ یہ کہ مدحتِ حضورؐ کا جو رنگ خالد کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اس میں والہیت شامل محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ خالی شعر طرازی کیا، غیر مسلم بھی نعتیں لکھتے رہے ہیں اور کمیونسٹ بھی لکھتے ہیں۔ خالد کے نعتیہ کلام میں حضورؐ کی عظمتوں کے بیان کے ساتھ ایک درد و کیف پایا جاتا ہے۔ یہی وہ درد و کیف یا والہیت ہے جس سے متاثر ہو کر میں ان کے یہاں کی غزلیہ شاعری کے متضاد رنگ سے پریشان ہو جاتا رہا ہوں۔ میرے فہم سے بالاتر ہے کہ رسولِ برحقؐ کا کوئی محب ویسے مضامین اور ویسے الفاظ کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ جو ہماری اور دنیا بھر کی سیکولر شاعری میں رائج ہیں۔ شاید میری مشکل یہ ہے کہ میرا ذوقِ توحید انسان کی وحدتِ شخصیت کا قائل ہے۔
ماذ ماذ نعتیہ شاعری کا ایک فکر انگیز، ایمان پرور اور معلومات افزا مجموعہ ہے۔

نشاطِ آرزو (مجموعہ اشعار)
شاعر: انجم فاروقی
قیمت: بارہ روپے
معیار متوسط: ضخامت ۱۳۶ صفحات
مؤلف سے (جھونڈہ ضلع سیالکوٹ) طلب کریں

فی نفسہ یہ بات خوشی کی ہے کہ جناب انجم فاروقی اقبالؒ کے سرچشمۂ فکر سے استفادہ کرنے والوں میں سے ہیں اور وہ شعر میں اسلامی ذوق کا رنگ برقرار رکھتے ہیں۔
حمد، نعت، قومی نظموں اور غزلیہ اشعار کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے بہت قابل قدر ہے کہ اس پر کسی تخریبی نظریے کا پرتو نہیں پڑا۔ فاروقی صاحب کے بعض اشعار بہت پسند بھی آئے۔ مگر ایک کمزوری جو اکثر اسلامی زاویۂ نگاہ رکھنے والے شاعروں میں درجہ بدرجہ پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ فنی اور لسانی استحکام نہیں پایا جاتا۔ فصاحت و بلاغت کے اصول نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ شعریت کی وجد آفریں رُوح کم اثر رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ایسے اشعار کم ملتے ہیں جو از خود یاد ہو جائیں۔ یا ایسی نظمیں جنہیں یاد رکھنے کو جی چاہا ہے۔ اقبال کا کمال یہی تھا کہ انہوں نے پُر زور اسلامی افکار کو پیش کرنے کے لیے شاعری کا جو پیرایہ اختیار کیا ـــ وہ فنی و لسانی لحاظ سے مناسب اور اثر انگیزی کے لحاظ سے حد درجہ دل نشیں تھا۔ الفاظ کو استعمال کرنے میں، خیالات کو ترتیب دینے میں اور اپنے پیغام کو شعر کی نازک سطح تک پہنچانے میں انہوں نے

بھرپور طور پر اپنی تخلیقی قوتوں کو استعمال کیا۔ اقبال کی شاعری میں کہیں جمال غالب ملے گا، کہیں جلال، (جو خود بھی ایک پیرایۂ جمال ہے) یعنی اُن کا شعر کبھی نغمۂ جبریل ہوگا، کبھی صورِ اسرافیل۔

اقبال سے اثر لینے والے نوجوان شعراء میں سے اکثر کی توجہ معنی و مقصد کی طرف اتنی زیادہ ہو گئی ہے ——— اور ماحول میں اس کے وجوہ موجود ہیں ——— کہ وہ فنی، لسانی اور تخلیقی عمل کی جگرکاویوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ شعر کی دُنیا میں فکرِ باطل سے آویزش جبھی کی جا سکتی ہے کہ پہلے شعریت کے لحاظ سے دوسروں سے زیادہ قبولیت حاصل ہو۔ ورنہ بہترین صداقتیں اگر گھٹیا لباس میں داخلِ محفل ہوں گی تو حاضرین کی توجہ حاصل نہ کر سکیں گی بلکہ بعید نہیں کہ تنقید یا تمسخر کا نشانہ بن جائیں۔

دلی تمنا ہے کہ نہ صرف فاروقی صاحب، بلکہ دوسرے اسلام پسند شعراء بھی ایک بارِ سعئ تازہ کا آغاز کریں۔ ابھی پورے اعتماد سے معرکہ آرائی کا مرحلہ نہیں آیا۔

بہرحال احباب کو چاہیے کہ نشاطِ آرزو کو شاعر کے جذبات کے مطالعہ کے لیے ضرور پڑھیں۔ اور اس کی ہمت افزائی کریں۔

اقبال اور پاکستان
پروفیسر محمد عبدالرشید فاضل
ناشر: ادارہ تنویر علم و ادب
۵۰۵ - پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی
قیمت مجلد مع گرد پوش ۲۰/- روپے

اس کتاب کے پیش لفظ میں محمد حسین عرشی امرتسری نے ایک دلچسپ قولِ عام نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہ "اگر انگریز اقبال کو سمجھتا تو وہ ایک دن بھی قیدِ فرنگ سے آزاد نہ رہ سکتے، اور اگر مسلمان سمجھتا تو وہ ایک دن بھی غیر کا محکوم نہ رہتا۔"

بہرحال مؤلف نے اس کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے قوم کو محض پاکستان (تہذیب اسلامی کے تحفظ و فروغ کے لیے ایک جداگانہ وطن و ریاست) کا محض تصور ہی نہیں دیا بلکہ اُس کے لیے ایسی اخلاقی اور دینی بنیادیں بھی فراہم کی ہیں جن پر پاکستان کی عمارت قائم ہو جائے اور باقی بھی رہے، اور اس کے ذریعے وہ مقاصد بھی حاصل ہو جائیں جن کے لیے اس کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

اس نقطۂ نظر کے تحت محمد عبدالرشید صاحب نے اقبال کی دو اہم کتابوں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے مطالب کی وضاحت کی ہے۔ مگر اس وضاحت کو ایک امتیازی درجہ اس وجہ سے حاصل ہے کہ بقول عرشی صاحب مؤلف کا " انداز شرح نیا اور انوکھا ہونے کے ساتھ اقبال کی حقیقی ترجمانی بھی کی ہے"۔ نیز " علامہ کے بہت سے اشعار جن کو پڑھ کر قاری لطف اٹھاتا ہے۔ سید فاضل کی نگاہ ژرف بیں نے اُن سے تاریخی اشارے نکالے ہیں جو تاویل و تکلف سے پاک، صداقت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔"

مراد یہ ہے کہ اقبال کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کو اگر عام سطح سے دیکھا جائے تو کچھ علمی یا اسلامی حقائق سامنے آجاتے ہیں، لیکن اگر عام سطح سے نیچے ذرا گہرائی میں اتر کر نگاہ ڈالی جائے تو اقبال کی بہت سی عام باتیں پاکستان کی مطلوبہ اسلامی ریاست کے متعلق خاص اشارات اپنے اندر رکھتی ہیں۔ مؤلف نے ان خاص اشارات کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔

توقع ہے کہ پاکستان کے خیرخواہ، خصوصاً سلیم الفطرت طلبہ اس کتاب کو اپنے لیے مفید پائیں گے۔

(بقیہ اشارات) کے لیے عوام کا معلم بنے، یا وہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے عاید کردہ فریضۂ دعوت کا علمبردار بن کر کام کرے۔

اس قسم کے لوگ جب دین کا کام کرنے والوں میں گھس کر اپنے لیے پناہ گاہ تلاش کر لیتے ہیں تو وہ بہت سے نیک دل لوگوں کو شکار بنالتے ہیں۔ اور فی الحقیقت اقامتِ دین کی مہم کی سست رفتاری اور دوسروں کی سرگرمی کار میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مایوسی، بد دلی، افسردگی اور ناکارہ پن کو فروغ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ داغدار ضمیروں کے ساتھ خدا کی راہ میں بڑھتے چلے جانا ممکن نہیں۔ داغدار ضمیر رکھنے والے عناصر دعوتِ حق اور غلبۂ حق کی جدوجہد کے لیے غیر محسوس طریق پر دیمک کا کام کرتے ہیں۔

کوئی فرد جو خدا کے دین کا خادم بن کے اُٹھے، جہاں وہ خود اپنے دامن کو مالی اور معاملاتی آلائشوں سے پاک رکھنے کی اُس طرح بے تابانہ فکر کرے، جیسے کسی نیک اور شریف گھرانے کی کنواری لڑکی اپنی عصمت کا تحفظ کرتی ہے ـــ وہاں اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ ایسے افراد کو ہرگز پناہ نہ دے جو ایک طرف دین کے کام میں حصہ دار بنیں اور دوسری طرف لوگوں کی حق ماری اور دل آزاری کرنے والے ہوں۔ فرد کی طرح کوئی ایسا ادارہ یا ایسا گروہ جو اخلاص سے خدا اور رسول ؐ کی دعوت پھیلانے کی ذمہ داری اپنے سر لے، اُس کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ بدمعاملہ لوگوں کو بغیر اصلاح و تلافی کے اپنے اندر جگہ نہ دے، اور کوئی ایسا آدمی اندر موجود ہو تو اس سے درخواست کرے کہ آپ تشریف لے جائیں تو آپ کا احسان ہوگا۔

خادمانِ دین میں اخوت و محبت کا رشتہ مضبوط رکھنے کے لیے ایک ضروری بات یہ ہے کہ کسی لائبریری یا جلسے یا خدمتِ خلق کی کسی مصروفیت میں جو میل جول ہوتا ہے۔ وہ حصول مدعا کے لیے کافی نہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ بات نہایت لازم ہے کہ جتنے لوگ بھی آپس میں ربط رکھ سکتے ہوں، وہ ایک دوسرے کی ذاتی زندگی سے بھی دلچسپی لیں۔ اخباری اور قومی حالات پر گفتگو میں، فلسفیانہ بحثیں یا دینی و فقہی نکات پر تبادلۂ خیالات سے ہٹ کر کبھی کبھار کوئی سے دو تین افراد کو نجی سطح پر مل بیٹھنا چاہیے۔ آنے والے کہہ سکیں کہ ہم صرف ایک بھائی کی ملاقات کے لیے آئے

ہیں۔ پھر بات چیت میں اس سے معلوم کریں کہ اس کی معاش کیا ہے؟ مالی مسائل کیا ہیں؟ اس کے کتنے بچے ہیں؟ اس کے چھوٹے بچوں کی تعلیم کیسے ہو رہی ہے؟ اور بڑے بچے کس روزگار میں ہیں؟ ان سب کے دینی شعور کا کیا حال ہے؟ گھر میں کسی بیماری سے سابقہ تو نہیں؟ لڑکوں، لڑکیوں کے مستقبل کیا پیش نظر ہیں؟

یہ ضروری نہیں کہ سارے سوال و جواب ایک وقت میں ہو جائیں اور آدمی دوسرے کا انٹرویو لینے بیٹھ جائے۔ نجی اور گھریلو معاملات کسی قدر حجاب میں رہتے ہیں اور ہر شخص چاہتا ہے کہ اُسے پردہ بالکل اُلٹ نہ دینا پڑے۔

پھر یہ حقیقت تمام دوستوں کو جاننی چاہیے کہ کسی آدمی کے اندر اُتر کر اُس کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہونے والے احوال و مسائل کو جاننا آسان نہیں ہے۔ کوئی شخص دل کا دروازہ اس طرح نہیں کھول دیتا جیسے آپ شیروانی کے بٹن کھولتے ہیں۔ اپنے کسی بھائی کو پوری طرح جاننا پوری طرح سمجھنا اور پوری طرح اُس کی دوستی کا حق ادا کرنا خلوص و اعتماد کے بغیر ممکن نہیں۔ خلوص و اعتماد کارفرما بھی ہو، اور خلوص و اعتماد کو مخاطب محسوس بھی کرلے۔ ایک ملاقات میں نہ سہی، چار چھ دس ملاقاتوں میں سہی۔ دین کی سچی خدمت کرنے والے بھائیوں کے اندر چھپے ہوئے اُس آدمی کا مطالعہ کیجیے جو دوسرے کئی لوگوں کی طرح مسائل کی دلدل میں لت پت ہے۔ ہو سکے تو کسی مشکل کو جاننے کے بعد احسان دھرے بغیر اُسے اپنی ٹھوس عملی تائید سے بہرہ مند کیجیے۔ یہ ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے دوست کو مدد کے لیے اُٹھایئے۔ یہ بھی نہیں تو کم از کم اچھے الفاظ سے اُسے سہارا دیجیے، مگر بناوٹی الفاظ سے نہیں، حقیقی دردمندانہ الفاظ سے۔

مثلاً بیمار کی بیمار پُرسی کے حکم کا مدعا اتنے سے پورا نہیں ہو جاتا کہ آپ گئے اور ہاتھ پیشانی پر رکھا اور مسنون طریق سے کہا کہ " الطھور ان شاء اللہ " بلکہ آپ کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ جانیں کہ علاج کافی اور معیاری ہو رہا ہے یا نہیں؟ علاج کے مصارف کا انتظام ہے یا نہیں — ؟ تیمارداری کے لیے گھر کے افراد کافی ہیں یا نہیں؟ مریض ہسپتال میں ہے تو وہاں کی بھاری آزمائشیں کیا کیا ہیں۔ اور کس پیچیدگی کو کیسے دُور کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جنازوں کی مشایعت اور غم زدگان کے سامنے تعزیت کے لیے چند کلمات افسوس کہہ کر دُعا کر دینا ہی سب کچھ نہیں ہے یہ بھی تو معلوم کیجیے

کہ مرحوم کے سر کیا بوجھ باقی رہ گئے اور مرحوم کے پسماندگان کو کیا مشکلات درپیش ہیں پھر کسی کا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے، کسی کی ملازمت چھوٹ جاتی ہے، کسی کے ہاں چوری ہو جاتی ہے۔ کوئی غنڈوں کی مار دھاڑ کا نشانہ بنتا ہے۔ کسی کو پولیس کے ہاتھوں پریشانی پیش آتی ہے۔ کوئی دفتری دنیا میں دھکے کھا رہا ہے، کوئی کچہریوں کی انسانیت کش فضاؤں میں انصاف ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ غرضیکہ انسانی زندگی کے ہزار چکر ہیں۔ ان چکروں میں پڑنے والے کسی بھائی کو یہ محسوس نہ ہونے دیجیے کہ وہ تنہا ہے اور اس کو تھامنے اور سہارا دینے کے لیے خدا کے سوا اس محسوس دنیا کا کوئی فرد نہیں ہے۔

اپنے دل میں حالات کا جائزہ لے کر خود ہی فیصلہ کیجیے کہ آپ پر اس سلسلے میں جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں اُن کو آپ اپنی بساط کے مطابق کسی چھوٹے یا بڑے دائرے میں نبھاتے آ رہے ہیں؟

اگر نہیں تو، دین کے محاذ کو کمزور کرنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔ اگر اس سبب کو آپ بھی تسلیم کرلیں تو پھر اسے ختم کرنے کے لیے اور زیادہ بہتر رویے سے محبت و اخوت کے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے کام کیجیے۔

اُمید ہے کہ متذکرہ گذارشات میں احوال کا جو تجزیہ دیانت داری سے میں نے کیا ہے، اُس میں سے کچھ نہ کچھ جوہرِ حقیقت ایسا مل جائے گا کہ آپ اپنی برادری کو محبت و اخوت کی دولت سے مالا مال کر کے دعوت کے کام کو مضبوط بنا سکیں۔

کچھ باتیں اور! ــــ ان شاء اللہ آیندہ!

گذارشِ احوالِ واقعی

بہ سلسلہ اداراتی ڈاک ترجمان القرآن

گہرے دلی احساسِ ندامت کے ساتھ میں ان تمام اصحاب سے عفو چاہتا ہوں جو ایڈیٹر ترجمان القرآن کے نام خطوط لکھتے ہیں اور ان میں سے بہت سے اہم اور فوری جواب طلب ہوتے ہیں۔ ادھر میرا یہ حال کہ علالت کے مستقل چکر میں پھنسے ہوئے ترجمان القرآن کے جملہ اداراتی امور (بڑے اور چھوٹے) کو تنہا کسی نائب بلکہ محض دفتری معاون تک کی مدد کے بغیر بصد مشکل پورا کرتا ہوں۔ اس پر کچھ ایسے متفرق زائد کام مجھ پر واجب ہو جاتے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا بڑی جان ماری چاہتا ہے۔ ایک سلسلہ ملاقاتوں کا بھی ہے جو خود میرے لیے مبارک اور ہمت افزا ہے۔ حالات کے اس ٹیڑھ کی ساری زد خط و کتابت پر پڑتی ہے۔ بیشتر خطوط کو بہت اہم اور بعض کو فوری جواب طلب جانتے ہوئے بھی، ساری ڈاک کا ذخیرہ کرتا رہتا ہوں، خواہ جواب لکھنے کا موقع دو ماہ بعد ملے۔ خط لکھنے والوں پر تادیر جواب نہ پاکر جو کچھ گذرتی ہو گی اور میری نالائقی اور غیر ذمہ دارانہ پن کا جو تصور وہ قائم کرتے ہوں گے اُس کا مجھے اندازہ ہے۔ مگر جواباً انہیں اندازہ نہیں کہ ریویو کی کتابوں، مسودات، میز پر بے ترتیب کاغذات کے ڈھیروں کو نظم و ترتیب دینے کے لیے بھی کوئی مدد کرنے والا ہاتھ موجود نہیں ہے۔ سو میں اپنی تسکین تو اس یقین سے کر لیتا ہوں کہ اصل مالک تو علیم و خبیر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خطوط لکھنے والوں کی پریشانی کا ازالہ کیسے ہو؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا انتظام بھی وہی ہستی مختار و کارساز کر سکتی ہے، جب وہ جیسا چاہے۔ کئی ماہ کے پیچ و تاب کے بعد یہ سطور، احوالِ واقعی کو واضح کر کے اپنے محبوں اور ترجمان القرآن کے قارئین سے معذرت چاہنے کے لیے لکھی ہیں۔

"شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات!"

میری دلی تمنا یہی ہے کہ مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور کے جاری کردہ رسالہ کے تمام معاملات معیاری حد تک درست رہیں۔ موجودہ حالات تو یہی بتاتے ہیں کہ کچھ اپنے ہی گناہوں نے ایک اچھی تمنا کی تکمیل کا راستہ روک رکھا ہے۔ استغفرک یا غافر الذنب۔

(ن۔ م)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کے خلاف

ذاتی اور شخصی، مذہبی اور سیاسی الزامات کا تجزیہ

مولانا مودودیؒ پر جھوٹے الزامات

اور

اُن کے مُدلّل جوابات

تالیف

عاصم نعمانی

• سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ • ضخامت: ۱۲۸ صفحات • قیمت: پانچ روپے

ناشر: مجلس احباب، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

ملنے کا پتہ

• ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور • مکتبہ تعمیر انسانیت - اردو بازار لاہور
• اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور • یین اسلامک پبلشرز، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
• ادارہ مطبوعات طلبہ، اچھرہ، لاہور • شیخ فقیر حسین صاحب، منصورہ ملتان روڈ لاہور
• مکتبۂ افکار اسلامی، بازار شاہ فیصل شہید راولپنڈی • البدر بک کارپوریشن، صدر، کراچی۔

تفہیم القرآن
کے بعد

تفہیمِ سیرتِ پاک کے لئے

سیرتِ سرورِ عالم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے قلم سے

جلد اوّل و دوم

دوسرا ایڈیشن طویل انتظار کے بعد طبع ہو کر آگیا ہے

جلد اوّل ــــــــ بنیادی مباحث

جلد دوم ــــــــ حضورؐ کی ولادت سے ہجرت تک

کتابت و طباعت کا معیار دلکش • جلد بندی نفیس

ضخامت جلد اوّل ــــ ۴۶۷ صفحات • ضخامت جلد دوم ــــ ۴۶۷ صفحات

دونوں جلدوں میں نقشے اور تصاویر شامل ہیں

قیمت فی سیٹ - اعلیٰ ایڈیشن ۲۰۰/- روپے
قیمت فی سیٹ - قسم عام ۸۰/- روپے

شائقین اور ایجنٹ حضرات اپنے آرڈروں کے ساتھ پیشگی قیمت روانہ فرمائیں
آرڈروں کی تعمیل ترتیب وار ہوگی

•

ادارۂ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور